کتابی سلسلہ موسمِ گرما 2014

شمارہ: 01

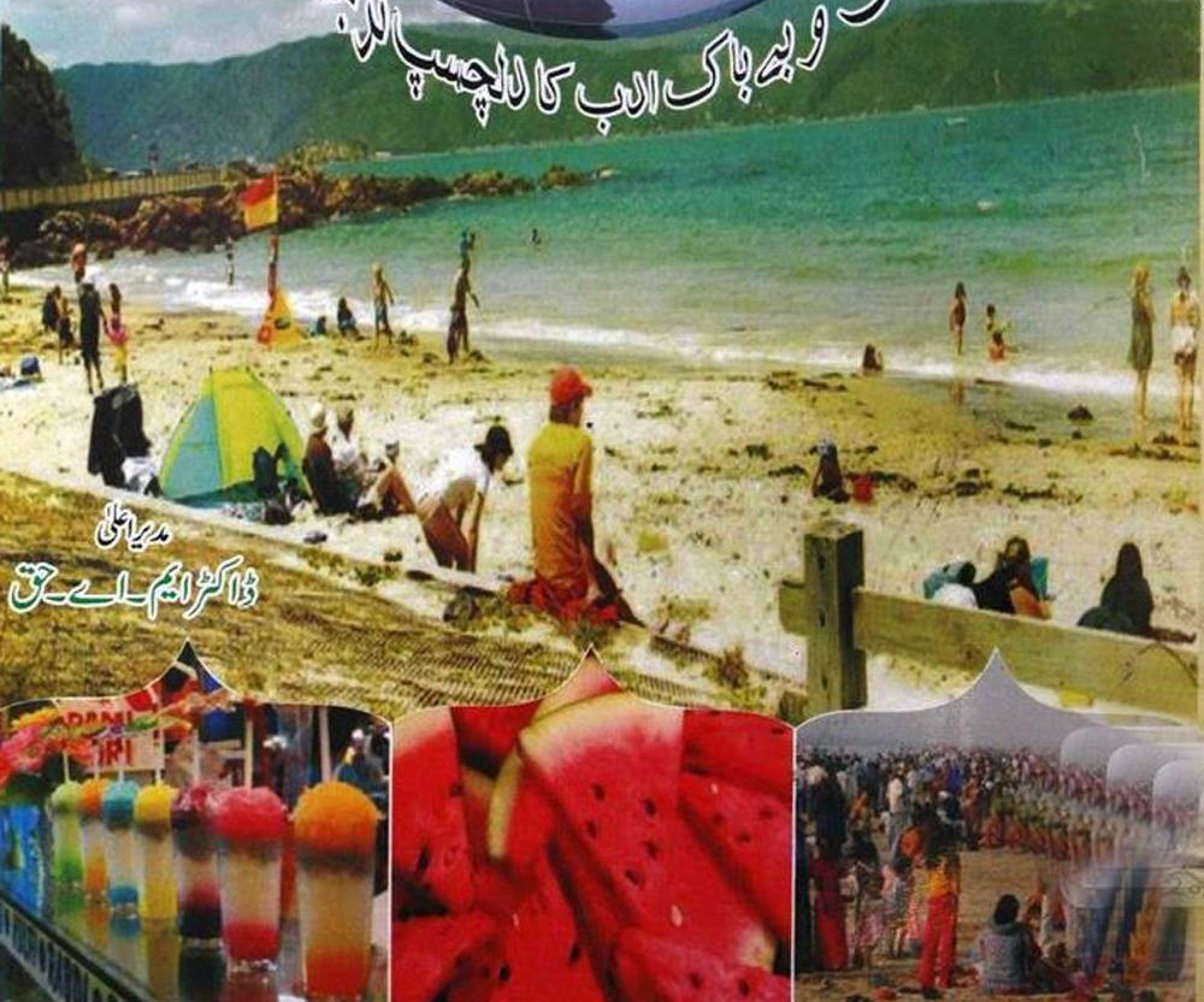


ڈاکٹر ایم۔اے۔حق

مدیر اعلیٰ

عالمی انوارِ تخلیق

معیاری و بے باک ادب کا دلچسپ ترجمان



مدیر اعلیٰ

ڈاکٹر ایم۔اے۔حق

سرپرستانِ عالمی انوارِ تخلیق



اقبال خلیل (ادب نواز)
Founder Secretary
Rayeen Urdu Girl's +2 High School
Lake Road,Ranchi 834001(Jharkhand)
09431355553 iqbalkhalil206@gmail.com



بی۔ایس۔جین۔جوہر (شاعر)
B-7,Industrial Estate,partapur,Delhi Road
Meerut 250103 (INDIA) 09358400900
agromec@vsnl.com, handyindia@vsnl.com
www.agromecindia.com, www.handyindia.com



سید رضا عباس رضوی (چھبّن) (ادب نواز)
H.N 72,Road No 02,Block no 02
Shastri Nagar,Post Kadma,Jamshedpur 831005
(Jharkhand) 09934500400

انتظامیہ عالمی انوارِ تخلیق



ڈاکٹر ایم۔اے۔حق
مدیر اعلیٰ
Haque Manzil,Ghosh Compound
central street,Hind Piri,Ranchi 834001(Jharkhand)
09304127908 :abrarafsananigar@gmail.com



عبداللہ نادان
معاون مدیر
Reporter: Daily FAROOQUI TANZEEM
Anjuman Plaza, Main Road Ranchi.834001
09835114767 E-mail. abdullahnadan@yahoo.com



محبوب حسن
مدیر
Research Scholar
Room No 131 ,Brahamputra Hostel,
JNU New Delhi 110067
08527818385:mahboobafaqi@gmai.com



ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اعزازی مینیجنگ ایڈیٹر
H.O.D Urdu,C.C.S University Meerut(U.P)
09456259850:aslamjamshedpuri@gmail.com

تفصیلاتِ عالمی انوارِ تخلیق

شرح خریداری

فی شمارہ 50روپے سالانہ 150 (معمولی ڈاک سے،
جس کے موصول ہونے کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔)
بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک۔225روپے۔

امریکہ و یوروپی ممالک	پاکستان و خلیجی ممالک
75امریکی ڈالر	1200روپے

ترسیلِ زر کا پتہ

Mrs S. Perween
Haque Manzil Ghosh compound
Central Street, Hind Piri, Ranchi
834001 (Jharkhand) INDIA
ای میل anwaretakhleeque@gmail.com

رقم ڈرافٹ یا چیک کے ذریعہ ہی قبول کیے جائیں گے جو
Suraiya Perween کے نام سے ہونا چاہئے۔

اس شمارے کے مشمولات میں ظاہر کردہ خیالات و نظریات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔
کسی بھی تحریر/اقتباس کے لئے صاحبِ قلم خود ذمہ دار ہوں گے

قانونی مشیر

عبد العلام

سینئر ایڈوکیٹ جھارکھنڈ ہائی کورٹ، رانچی

کسی بھی قسم کی قانونی چارہ جوئی کے لئے صرف رانچی (جھارکھنڈ) کی عدالتیں ہی مجاز ہوں گی۔

کمپوزنگ، ٹائٹل پیج اور اشتہارات: **فاسٹ انٹر پرائزیز، رانچی**

پبلیشر مسز ثریا پروین نے آفسیٹ آرٹ پریس، ایلیٹ روڈ، مکلارڈ اسٹریٹ، کولکاتا سے طبع کرا کر دفتر انوار تخلیق، حق منزل گھوش کمپاؤنڈ سنٹرل اسٹریٹ ہند پیڑھی، رانچی سے جاری کیا ہے۔

فہرست

تعزیت نامہ

گذشتہ عرصہ ملک و بیرون ملک کے نامور ادباء و شعراء اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے ہیں۔ اُن کی رحلت اردو دُنیا کے لئے واقعی ایک نا قابلِ تلافی خسارہ ہے۔ ہم اُن کی مغفرت کے لئے اللہ سے دعا گو ہیں۔

سرپرستان، ادارتی بورڈ، انتظامیہ و معاونین

عالمی انوارِ تخلیق کی پوری ٹیم

حمد باری

فرحت حسین خوشدلؔ
09798562194

لب پہ ہے حمد و ثنا اے مالکِ ارض و سما
میں تری توصیف کا کیسے کروں گا حق ادا
یہ ترا لطف و کرم ہے مجھ پہ اے ربّ الوریٰ
بندۂ مسکیں کو ہر اک شئے کیا تو نے عطا
تیری عظمت، تیری قدرت، کے کرشمے بیکراں
ہے پرے ادراک سے تو، فہم سے تو ماورئ
اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے بھیجے نبیؐ
ان کے آنے سے ملی انسان کو راہ ھدیٰ
میرے مولیٰ یہ تیرا مجھ پر بڑا احسان ہے
احمد مرسلؐ کی امّت میں مجھے پیدا کیا
غیر سے میں نے کبھی کچھ آج تک مانگا نہیں
بس ترے آگے ہی پھیلاتا ہوں میں دستِ دعا
گرچہ میں عاصی مگر ہوں مغفرت کا ملتجی
صدقے میں پیارے نبیؐ کے بخش دے میری خطا
روز محشر سایۂ رحمت میں تری میں رہوں
لب پہ خوشدلؔ کے الٰہی سے یہی بس اک دعا

❀❀❀

نعتِ رسول

بیکلؔ اُتساہی
09415120838

مہرباں رسول ہوگئے
خار سارے پھول ہوگئے

❀❀❀

پڑگئی نگہہ مُصطفےٰ
لوگ با اصول ہوگئے

❀❀❀

ظالموں میں رحم آگیا
ظلموں و جبر دھول ہوگئے

❀❀❀

چل رہے ہیں راہ میں حضور
گلفشاں ببول ہوگئے

❀❀❀

دُشمنی کے قصے گھٹ گئے
دوستی کے طول ہوگئے

❀❀❀

بیکلؔ اب غرور و تمکنت
وقت کے فضول ہوگئے

❀❀❀

گوشۂ ادارتی بورڈ

افسانچے، کہانیاں اور سائبر کے درخت پر گلہڑ کے پھول

مشرف عالم ذوقی

گلہڑ کے پھول کیا ہیں؟

بچپن میں اماں کہتی تھیں...... گلہڑ کے پھول کو ماما جنات اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ سمجھاتی ہوئی لتاں چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی پٹاری کھول لیتی تھیں—بڑا ہو کر افسانے لکھنے لگا تو لتاں کی پٹاریاں ماضی کے دریچوں سے کھل کھل کر ماما جنات، گلہڑ کے پھول اور روایتی کہانیوں کو علامت اور فنتاسی میں تبدیل کر چکے تھے...... گھر کے پیچھے پیپل کا پیڑ تھا۔ اب یہ پیڑ نہیں ہے۔ ابو چاچا کہا کرتے تھے...... اس پر ایک بھوت رہتا ہے۔ اب تو اُس کی عمر سو سال سے زیادہ ہو چکی ہے۔ کہانیاں بھی ماما جنات، گلہڑ کے پھول اور روایت سے گزرتی ہوئی سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزار چکی ہیں۔ ان سے الگ تصور کریں تو ہم ایک ایسی مہذب دنیا میں ہیں جہاں چاروں طرف ٹکنالوجی کا جال بچھا ہوا ہے۔ داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا سے نکلی ہوئی کہانیاں اب وادیٔ حیرت تک نہیں لے جاتیں۔ سائنس کے طلسم نے دادی لتاں کی جادوگری کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اب ننھے بچے دادی اماں، نانی اماں سے کہانیاں نہیں سنتے۔ ہوش سنبھالتے ہی لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ٹی وی پر دکھائے جانے والے ایک اشتہار کی بات کروں تو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہی ایک بچہ اپنے لیپ ٹاپ اور کمپیوٹر کو تلاش کر لیتا ہے۔ ساتھ ہی گوگل اور فیس بک پر خود کو اپ لوڈ بھی کر لیتا ہے۔

یہ نئی دنیا کی تصویر ہے جسے ہماری دنیا اور اشتہاری دنیا دونوں نے قبول کر لیا ہے۔ سماج کا چہرہ تبدیل ہوا ہے۔ سیاست بھلے وہی پرانی نفرت کی تاریخ لکھ رہی ہے مگر سیاست کے بڑے استعمال کو سوشل نیٹ ورکنگ سے جوڑ دیا گیا ہے۔ نئے سماج کے بچے بھی بدلے ہیں۔ پیزا اور برگر کی یہ دنیا ہزاروں تبدیلیاں لے کر سامنے آئی ہے۔ لیکن غور کیجئے تو کیا ان کے اثرات اردو افسانے پر ہیں؟ میرا خیال ہے نہیں—زیادہ تر افسانہ نگار 'ہر من پیسے' کے مطابق پرانی دنیاؤں کو اس طرح گلے لگائے ہوئے ہیں کہ یہ دنیا گئی تو سماج، معاشرہ اور مذہب خطرے میں پڑ جائے گا۔ ہمارے ادب میں تبدیلیاں کم بولتی ہیں یا بولتی ہی نہیں ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی جیسے ادیب روایات یا کلاسیکی ادب کو آج بھی کیش کرانے کی کوششوں میں لگے ہیں اور ان کا ادب مکمل طور پر نئی روشنی سے خالی ہے۔ ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہماری زبان روز بروز گم ہوتی جا رہی ہے۔ غور کریں تو نئی نسل کا آنا رک گیا ہے۔ پرانے لوگ بہت کم لکھ رہے ہیں یا شوقیہ خود کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ادب میں نئے خوشگوار جھونکوں کی آمد ٹھہر گئی ہے۔ مگر ہم صرف اپنی مایوس سوچوں پر تکیہ نہیں کر سکتے۔ اردو کو زندہ رکھنا ہے تو نئی نسل میں وہ جذبہ پیدا کرنا ہوگا جو ان کے دلوں میں اردو زبان کے لیے محبت جگانے کا کام کرے۔ اور زندہ ادب کا تقاضہ ہے کہ ہم نئی روشنیوں کو سلام کریں۔

کہانیوں سے نکل کر ہم افسانچوں کی طرف آتے ہیں تو یہاں کی دنیا کچھ کھیلتی یا لٹو نچاتے بچوں کی دنیا معلوم ہوتی ہے۔ غالب جب دو مصرعوں میں زندگی سے وابستہ نئی فکر اور نئے فلسفوں کو آواز دے سکتا ہے تو افسانچوں میں یہ نئی دنیا آباد کیوں نہیں ہو سکتی—؟ اس کا سیدھا جواب ہے کہ آباد اس لئے نہیں ہو سکتی کہ ان میں زیادہ تر تو لوگوں کے پاس ادب کا کوئی واضح تصور ہی نہیں ہے۔ مطالعہ نہیں ہے۔ مشاہدہ نہیں ہے۔ زیادہ تر افسانچے نصیحت اور تبلیغ کی سطح پر لکھے جا رہے ہیں۔ اور کہیں کوئی نیا پن ہے نہ فلسفہ— جبکہ یوروپ میں دیکھیں تو افسانچوی ادب میں انقلاب آ چکا ہے۔ مگر ہمارے افسانچہ نگار ابھی تک معمولی درجہ کا کرپشن، رشوت خوری، ہوس، میاں بیوی کے رشتے، فسادات کے تعلق سے چھوٹے موٹے مناظر تک الجھے ہوئے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ انہیں نہ لطیفہ قرار دے سکتے ہیں نہ افسانچہ۔ نہ فکر قرار دے سکتے ہیں نہ فلسفہ۔ اگر یہ افسانچے نہیں ہیں تو انہیں کیا کہا جائے۔ تضیع اوقات؟

پرانی اور نئی دنیا کے تصور سے بھی افسانچوں کی ایک نئی دنیا آباد کی جا سکتی ہے۔ مگر ہمارا افسانچہ نگار محض اس بات سے خوش ہے کہ اس کی دنیا میں ہر روز ایک افسانچہ نگار کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اور مجھے یہی بات اداس کرتی ہے۔ کارواں بڑھ رہا ہے اور ایسے لوگ سامنے آ رہے ہیں جو کہانیاں، افسانچے کے الف ب سے بھی واقف نہیں۔

چلیے میں ایک سائنس افسانچہ لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔۔۔
''ایک بچے نے میدان میں کھیلتے ہوئے اچانک آواز لگائی۔ 'اماں...... یہاں سائبر کا ایک درخت پیدا ہوگیا ہے......
اماں مطمئن تھی...... ایک ہفتہ پہلے لیپ ٹاپ ٹھیک کرنے والا آیا تھا...... ممکن ہے کہیں تار میدان میں گر گئے ہوں۔اس میں تعجب کی بات کیا ہے......؟
'اماں...... سائبر کا درخت...... شاخوں کی جگہ بجلی کے تار ہیں اماں...... دور تک پھیلے ہوئے...... اور ان کے آگے دیکھوں تو...... گلہڑ کا پھول ہے......'
اماں اس بار بھی مطمئن تھی...... گلہڑ کے پھول کہیں بھی پھل سکتے ہیں — ویسے ہی جیسے گلہڑ کے پھولوں والے جناتوں نے درختوں سے نکل کر اب ہمارے ساتھ رہنا شروع کر دیا ہے۔
بچے نے اس بار درخت پر چڑھنے کی کوشش کی تو بجلی کے تاروں سے الجھ کر رہ گیا...... لیکن کسی تار میں کوئی کرنٹ نہیں دوڑ رہا تھا۔ بچے کو گلہڑ کے پھول کی پروا نہیں تھی...... وہ اپنا کرکٹ بال تلاش کر رہا تھا اور اس کے خیال سے اڑتی ہوئی بال اسی سمت آئی تھی......
کیا آپ اس بچے کو دیکھ سکتے ہیں جو دیر سے سائبر کے درخت اور اُس کی شاخوں میں الجھا ہوا اپنا بال تلاش کر رہا ہے؟''
یہ افسانچہ یہاں مکمل ہوا۔۔۔ اور اس کے لیے مجھے کچھ سوچنا بھی نہیں پڑا۔ اس میں دو باتیں صاف ہیں۔ بچے اپنے بچپن کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔۔۔ اور دوسری بات بچے سوشل میڈیا سے زیادہ قریب ہیں۔ تیسری بات یہ ہے، گھر کی مائیں، روایتی مائیں نہیں رہ گئیں۔ ایک پورا سسٹم تبدیل ہوا ہے۔
آپ اسے افسانچہ نہ مانیں۔ قبول —

لیکن صاحب، میرا مکالمہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ کہانیاں یا افسانچے سو سال پرانے انداز میں اب نہیں لکھے جائیں گے۔
میں نے کوئی سائنسی افسانچہ لکھنے کی کوشش نہیں کی — یہاں ساری اصطلاحیں بچوں کی ہیں۔ سائبر، تار، لیپ ٹاپ، یہ بچوں کی عام گفتگو کا حصہ ہیں۔ ہمارے افسانچے پر ابھی بھی مذہب یا روایتی عورت حاوی ہے۔ عورت کو ہم آج بھی اسی مرد کے نظریہ سے مرغی کے 'دربہ' میں بند دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں — آپ بھلے پُرانی دنیا سے تعلق رکھتے ہوں لیکن اپنے ذہن کو آزادی اور نئی روشنی نہیں دیں گے تو آپ کو لکھنے کا حق بھی حاصل نہیں ہے — یہاں آزادی کا مطلب بغاوت نہیں ہے کہ آپ کہیں، لڑکی اسکرٹ پہن کر آگئی یا جنسی تسکین چاہتی ہے تو کیا ہم اُسے آزاد کہیں — یہاں میرا کہنا ہے کہ یہ آپ کا معاملہ ہے ہی نہیں۔ ایسے سو گناہ مرد زیادہ کرتا ہے — مگر آج بھی عورتوں کی آزادی پر پہرے بٹھاتا ہے۔ دیکھنا ہے تو دونوں کو ایک نظر سے دیکھیے اور زندگی میں نہ سہی، ادب میں نئے جھونکوں کا استقبال کیجیے — ایک اور اہم بات جو میں کہنا چاہتا ہوں اس پر بھی غور کیجیے۔ عام طور پر افسانچوں کی حمایت میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ لوگ آج کی تیز رفتار دنیا میں نہ ناول پڑھنا چاہتے ہیں نہ افسانے، اس لیے افسانچے لکھے جا رہے ہیں تو اس فکر سے باہر نکلئے — امریکہ میں جب پہلی بار ۲۴ گھنٹے چینل شروع ہوا تب بھی کہا جا رہا تھا کہ ادب ختم ہو گیا۔ کتابوں سے دوستی کرنے والے یا دوست بنانے والے یا ادب پڑھنے والے ہر زمانے میں ہوں گے۔ کتابیں پرنٹ سے نکل کر ای بکس میں آگئی ہیں اور وہاں بھی مطالعہ کرنے والوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ ناول اور افسانے پڑھنے والے بڑی تعداد میں ہیں — اس لیے معمولی درجہ کے افسانچوں کی حمایت کے لیے اس طرح کے جواز نہ پیش کیجیے۔

کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے

افسانچوں کو نئی فکر اور نئی دنیا سے رو برو کرانے کی ضرورت ہے۔ اسے نصیحت اور تبلیغ کا ذریعہ نہ بنائیے۔ اسے لطیفہ اور چٹکلے کی شکل میں نہ پیش کیجیے۔ ورنہ ممکن ہے، اماں کی کہانیوں سے گلہڑ کا پھول تو گم ہو گیا، یہ افسانچے بھی اپنی چمک کھوتے ہوئے بھولی بسری کہانی بن جائیں گے۔

❀❀❀

قارئین سے گزارش

''عالمی انوارِ تخلیق'' کے اس کتابی سلسلے کو مزید دلچسپ بنانے کے لئے ہمیں آپ کے سنجیدہ مشوروں کا بڑی بے صبری سے انتظار ہے،

مینجنگ ایڈیٹر



میری ماں

محترمہ **سائرہ اقبال** (مرحومہ)

زوجہ اقبال خلیل، ایڈوکیٹ، رانچی

راعین اُردو گرلس 2+ ہائی اسکول

لیک روڈ رانچی کی مشہور ٹیچر

اُردو کے فروغ کے لئے پورے رانچی شہر میں ایک بے مثال تحریک کار خصوصاً تعلیمِ نسواں کی زبردست حامی تھیں۔ وہ نہایت ہی مذہبی خیال کی خاتون تھیں۔ اُنہوں نے سورۃ یٰسین، سورۃ مزمّل و سورۃ رحمٰن کو معنیٰ کے ساتھ حفظ کر رکھا تھا۔

"عالمی انوارِ تخلیق" کے قارئین سے اُن کی مغفرت کے لئے پرخلوص دعاء کی درخواست ہے۔



ڈاکٹر ارشد اقبال

جنرل منیجر راما میڈیکل کالج، غازی آباد (یو۔پی)

انٹرویو

جوگندر پال

ڈاکٹر ایم۔ اے۔ حق

جوگندر پال جیسا بلند پایہ فنکار، مجسم فلسفہ ایک عظیم قلمکار اور اُن کے وجود میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی شرافت سے بھرپور عام انسانوں سا کردار کا یہ انٹرویو اردو ادب کی کوئی نادر پیش کش نہیں ہے۔ لیکن دو ملاقاتوں پر مشتمل اُن کے اس انٹرویو میں اُن کے بہت سے اچھوتے پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس انٹرویو میں اُن کی اہلیہ مسز کرشنا پال اور بیٹی مسز سوکرتی پال کمار نے کافی کوآپریٹ کیا ہے۔ ماں، باپ اور بیٹی تینوں کے ذریعہ اپنے حصول معاش کی خاطر اپنائے گئے انگریزی پروفیسرشپ کے باوجود اُردو زبان سے اُن کے والہانہ عشق اور بے پناہ لگاؤ سے میرا دل سرشار ہوگیا اور سر عقیدت سے جھک گیا۔ گھریلو ماحول میں کی گئی یہ گفتگو قارئین کو اُن کے ادبی ذوق میں اضافہ کے ساتھ ساتھ جوگندر پال کی زندگی کے مختلف اُتار چڑھاؤ سے واقفیت بھی عطا کرے گی۔ انٹرویو کے دوسرے دور میں اس کتابی سلسلے کے مدیر محبوب حسن کی شمولیت نے ہمیں کافی تقویت بخشی ہے۔

ڈاکٹر ایم۔ اے۔ حق:۔ آپ کی پیدائش کب اور کہاں کی ہے۔؟

جوگندر پال:۔ یوں تو میری پیدائش ۵ ستمبر ۱۹۲۵ کو سیالکوٹ کی ہے۔ لیکن صحیح معنوں میں میرے چار جنم ہوئے ہیں۔ میرا دوسرا جنم تب ہوا جب ۱۹۴۷ میں ملک کی تقسیم کے سبب مجھے وہاں سے ہجرت کر کے ہندستان کے شہر انبالہ آنا پڑا۔ میری تیسری پیدائش ۱۹۴۸ میں شادی کی شرط کے مطابق نیروبی (ایسٹ افریقہ) کے شہر کینیا میں ہوئی، جہاں میں نے افریقی سرکار کے ماتحت اسکول میں ٹیچر کی



نوکری کی شروعات کی تھی اور چوتھی بار میرا جنم ہندستان کے صوبہ مہاراشٹر کے اورنگ آباد میں ۱۹۶۴ میں ہوا جب میں نے وہاں کے پوسٹ گریجویٹ کالج سرسوتی بھون میں انگریزی پروفیسر کی حیثیت سے جوائن کیا۔

حق:۔ آپ لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دیں کہ دوسرے جنم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جوگندر پال:۔ میں اس بارے میں نہیں سوچنا چاہوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ جب میں مرجاؤں تو پوری طرح مرجاؤں۔ میں مرتے وقت اپنی غلطیوں کی معافی مانگتے ہوئے یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔

حق:۔ ہاں ابھی آپ نے شادی کی شرط کا تذکرہ کیا تھا۔ اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟ میں کچھ سمجھا نہیں؟

جوگندر پال:۔ بات دراصل یہ ہے کہ اُس زمانے میں نیروبی کے دولت مند لوگوں کو اپنی لڑکیوں کی شادی کے لئے بھی ہندستان آنا پڑتا تھا۔ وہاں کے قانون کے مطابق اگر کوئی لڑکا ایسٹ افریقہ میں پیدا ہوئی کسی لڑکی سے شادی کر لیتا تھا تو اُسے وہاں کی شہریت مل جاتی تھی۔ دولتمند لڑکی کے والدین ہندستان کے غریب لڑکوں کی تلاش کرتے تھے تاکہ اُسے نوکری کی لالچ میں وہاں لے جایا جا سکے۔ چونکہ میرا باپ نہایت غریب تھا، مُفلس تھا۔ گھر کی مالی حالت کافی خستہ تھی۔ گھر میں دودھ کا چھوٹا موٹا کاروبار تھا۔ میں سائکل پر دودھ کے کنٹینر کا بوجھ اُٹھائے دور دراز کے علاقوں سے دودھ خرید کر لاتا تھا۔ بس اُسی کی آمدنی سے ہمارا گھر چلتا تھا۔ میرے بہنوئی بھی لگ بھگ بے کار سے تھے۔ اُن کی بھی کفالت ہمیں کرنی پڑتی تھی۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا پھر بھی میرے والدین مجھے بدیش بھیجنے کو



تیار ہو گئے۔آپ اسی سے میرے خاندان کی غربت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

کرشنا پال:۔ اپنی شادی کی اصل داستان میں آپ کو سُناتی ہوں۔ جب میرے پتا جی اسی غرض سے ہندستان آئے تو کسی نے انہیں یہ خبر دی کہ انبالہ کے کسی کالج میں ایک لکچرار شادی کے لئے تیار ہے۔بس میرے پتا جی مجھے لے کر انبالہ اپنے بہنوئی یعنی میرے ماما کے گھر چلے گئے۔ جوگندر پال میری مامی کے بھائی تھے۔ان سے اس لڑکے کو تلاش کرنے کو کہا گیا۔بے چارے سیدھے سادھے جوگندر پال نے تین دنوں تک اُس لڑکے کو تلاش کیا۔لیکن کچھ پتہ نہیں چلا۔اس درمیان ہمارے خاندان کے لوگ جوگندر پال سے کافی مانوس ہو چکے تھے۔بس پھر کیا تھا۔لوہا گرم تھا۔میرے ماما کی ایک ہلکی سی پہل پر معاملہ طے پا گیا۔

حق:۔آپ اب لگ بھگ ۸۹ سال کے ہو گئے ہیں۔لیکن ماشاء اللہ آپ کی صحت بہت اچھی ہے۔اس کا راز کیا ہے؟

جوگندر پال:۔کوئی راز نہیں ہے بھئی! اپنی مرضی سے زندگی جیتا ہوں، جو ملتا ہے کھا لیتا ہوں، مطمئن ہوں، خوش رہتا ہوں، اپنے مفلسی کے دن یاد کرتا ہوں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔(کہتے ہوئے مسکرانے لگے۔میں نے موقعہ غنیمت جان کر ایک خالص ذاتی سوال داغ دیا)

حق:۔اچھا یہ بتائیے کہ شادی سے پہلے کیا آپ نے کسی سے عشق کیا ہے؟

جوگندر پال:۔نہیں معاشقہ تو کبھی نہیں کیا۔ہاں! لیکن ایک لڑکی تھی جو مجھے چاہتی تھی۔ مجھے ابھی اُس کا نام یاد نہیں آرہا ہے۔(پھر انہوں نے اپنی بیوی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اُن سے پوچھا)

کرشنا پال:۔ کہیں آپ اُس لڑکی کے بارے میں تو نہیں کہہ رہے ہیں جس کا تذکرہ آپ نے مجھ سے کیا تھا اور جس کی صرف ایک ہی آنکھ تھی۔

جوگندر پال:۔(تھوڑا طیش میں آکر) نہیں بھئی! اُس کی دونوں آنکھیں تھیں۔لیکن ایک میں کچھ خرابی تھی۔

کرشنا پال:۔اُس نے تمہیں ٹھیک سے نہیں دیکھا ہوگا۔(اس پر جوگندر پال صرف مسکرا کر رہ گئے۔)

حق:۔یہ آپ سے کتنے سال چھوٹی ہیں؟

جوگندر پال:۔تقریباً ساڑھے چار سال

حق:۔کیا آپ کی اہلیہ اردو سے واقف ہیں؟

جوگندر پال:۔ جی ہاں (پھر مُسکراتے ہوئے کہتے ہیں) اگر وہ اُردو نہیں جانتیں تو میں کب کا انہیں طلاق نہ دے دیا ہوتا۔میری اہلیہ سے رشتے کی معراج اُردو ہی ہے۔

حق:۔آپ کے گھر میں اور کون کون لوگ اُردو جانتے ہیں؟

جوگندر پال:۔ میری بیٹی سوکرتی بھی اُردو جانتی ہے۔لیکن میرے دونوں بیٹے سدھیر پال اور سُنیت پال اردو ہی نہیں ہندی بھی نہیں جانتے ہیں۔ان کا اوڑھنا بچھونا صرف انگریزی ہے۔

حق:۔آپ کے دونوں بیٹے کیا کرتے ہیں؟

جوگندر پال:۔ بڑا بیٹا سدھیر States میں سائنٹسٹ ہے اور دوسرا یہاں گوڑگاؤں میں آرکیٹکٹ ہے۔(کہتے ہوئے اُن کے چہرے پر آسودگی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں)

حق:۔آپ خود ایک ٹیچر تھے۔کیا آپ نے کبھی اپنے بچوں کو پڑھانے کے سلسلے میں انہیں مارا پیٹا؟

جوگندر پال:۔ جی کبھی نہیں۔ مجھے اس کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔

حق:۔آپ کی ابتدائی تعلیم کس زبان میں ہوئی تھی؟

جوگندر پال:۔ پہلی سے چوتھی تک صرف اُردو میں۔پانچویں سے انگریزی میں بھی پڑھائی کی تھی۔بی۔اے تک اُردو پڑھی لیکن اہم سبجیکٹ انگریزی ہی تھا۔

حق:۔آپ نے ایم۔اے کس سبجیکٹ میں کیا ہے اور کب؟

جوگندر پال:۔ میں نے پرائیوٹ سے ایم۔اے انگریزی ادب میں کیا ہے۔میں مئی ۱۹۵۵ میں کینیا سے لمبی چھٹی پر ہندستان آیا تھا۔یہیں پنجاب یونیورسٹی سے ستمبر ۱۹۵۵ میں امتحان دیا تھا۔

حق:۔آپ پنجاب میں پیدا ہوئے۔کیا آپ پنجابی جانتے ہیں؟

جوگندر پال:۔ دراصل پنجابی زبان کے دو اسکرپٹ ہیں۔ پہلا گورمکھی اور دوسرا شاہ مکھی۔ میں پنجابی زبان بولتا ہوں۔لیکن اسکرپٹ صرف شاہ مکھی ہی جانتا ہوں۔ میں گورمکھی بالکل نہیں جانتا ہوں۔

حق:۔ آپ پنجابی، اُردو اور انگریزی میں کیسے تال میل بیٹھاتے ہیں؟

جوگندر پال:۔ دیکھئے حق صاحب! پنجابی میری مادری زبان ہے،اس لئے گھر میں پنجابی میں بات چیت کرتا ہوں۔اُردو سے محبت کرتا ہوں اس لئے اس میں لکھتا ہوں۔ انگریزی میری ذریعہ معاش کی زبان تھی اس لئے اس میں پڑھاتا تھا۔اب تو شاذ ونادر ہی انگریزی کا استعمال کرتا ہوں۔

حق:۔ کیا آپ نے کبھی انگریزی میں طبع آزمائی کی ہے؟ اگر ہاں! تو کس صنف میں؟

جوگندر پال:۔ بہت کم۔ کچھ مضامین لکھے تھے۔

حق:۔ بچپن کی کوئی شرارت جواب تک یاد ہو۔

جوگندر پال:۔ غریب کا بچہ تھا شرارت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

حق:۔ کیا آپ نے کبھی ٹیوشن پڑھی ہے؟

جوگندر پال:۔ گھر میں جب کھانے کے لالے پڑے ہوں تو ٹیوشن پڑھنے کی کون سوچ سکتا ہے۔ہاں! میں نے ٹیوشن ضرور کی ہے۔ میں جب ایم۔اے میں تھا تو کچھ رقم اس سے کمالیتا تھا۔

حق:۔ آپ نے جوانی کے دنوں میں خوب سائیکل چلائی ہے۔کیا آپ نے کبھی بائیک یا کار چلائی ہے؟

جوگندر پال:۔ جی ہاں! خوب چلائی ہے۔



حق:۔ آپ اپنی سگریٹ نوشی کے بارے میں کچھ بتائیں۔

جوگندر پال:۔ ہائی اسکول سے پی رہا ہوں۔ پہلے ایک دو پیتا تھا۔کالج کے زمانے میں اس کی تعداد بڑھ کر سات آٹھ ہوگئی تھی۔

حق:۔ اور آج کل؟

جوگندر پال:۔ (بیوی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے) یہ پینے دیں جب نا۔

حق:۔ اب تک آپ نے کون کون سے ممالک کا دورہ کیا ہے؟

جوگندر پال:۔ نیروبی (ایسٹ افریقہ)، ماسکو، انڈونیشیا، انگلینڈ، امریکہ، دوہا، اور قطر۔

حق:۔ نوجوانی کے دنوں کی ایک تصویر میں آپ کی جھلک بہت حد تک مشہور اداکار دلیپ کمار سے ملتی ہے۔کیا آپ کے ذہن میں کبھی فلمی ہیرو بننے کا خیال آیا۔

جوگندر پال:۔ (سوال سُن کر اُن کے چہرے پر ناگواری کے اثرات نُمایاں ہوگئے۔لیکن خاموش رہے۔)

کرشنا پال:۔ (آہستہ لہجے میں) یہ سوال سُن کر وہ غصہ ہو جاتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ کوئی دلیپ کمار کا موازنہ مجھ سے کیوں نہیں کرتا ہے۔حق صاحب! آپ کا اندازہ بالکل صحیح ہے۔جب میں پہلی بار شادی کے بعد پال صاحب کو لے کر کینیا گئی تو میری سہیلیوں اور ملنے جلنے والوں نے پوچھا کہ میری شادی دلیپ کمار سے کیسے ہو گئی ہے؟

حق:۔ کیا آپ نے کبھی شعری ادب پر طبع آزمائی کی ہے؟

جوگندر پال:۔ جی نہیں۔لیکن مجھے شاعری اچھی لگتی ہے۔

محبوب حسن:۔ آپ کی نظر میں علامہ اقبال بڑے شاعر ہیں یا مرزا غالب؟

جوگندر پال:۔ مرزا غالب۔

محبوب حسن:۔ اس کی وجہ؟

جوگندر پال:۔ دیکھئے درحقیقت دونوں ہی عظیم شاعر ہیں۔بس مرزا غالب میں فطری پن کچھ زیادہ غالب ہے۔اُنھوں نے زندگی بالکل فطری پن سے جیا ہے۔

حق:۔ کیا آپ مشاعرہ کے شوقین ہیں؟

جوگندر پال:۔ بہت کم۔نہیں کے برابر

حق:۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ مشاعرے سے اردو زبان کا فروغ ہوا ہے۔آپ اس سے کس حد تک متفق ہیں؟

جوگندر پال:۔ تھوڑا بہت تو اثر پڑا ہی ہے۔

حق:۔ کیا آپ کو پینٹنگ سے دلچسپی ہے؟

جوگندر پال:۔ جی ہاں دلچسپی تو ضرور ہے لیکن کبھی بنائی نہیں۔

حق:۔ موسیقی سے لگاؤ؟

جوگندر پال:۔ گانا کبھی نہیں گایا۔ہاں سُننے کا شوق ضرور ہے۔

حق:۔ افسانوں میں عالمی سطح پر سعادت



حسن منٹو کے بعد آپ کا ہی نام لیا جاتا ہے۔آپ کا کیا خیال ہے؟

جوگندر پال:۔ ذرہ نوازی ہے جی آپ کی۔ویسے اپنے بارے میں خود کیا بولوں

حق:۔ ہندستان میں ابھی تک اس صنف کو شرف قبولیت حاصل نہیں ہوئی ہے آپ کا کیا خیال ہے؟

جوگندر پال:۔ آپ اس بات پر بالکل دھیان نہ دیں۔صرف افسانچے لکھتے رہیں، اس کا فروغ کرتے رہیں، ایک وقت آئے گا جب لوگ اس جانب متوجہ ہوں گے۔

حق:۔ ہندستان میں افسانچے کا مستقبل کیا ہے؟

جوگندر پال:۔ بس وہی بات ہے، افسانچے لکھتے رہیں، اس میں بہتری پیدا کرتے رہیں، مستقبل اپنے آپ تابناک ہو جائے گا۔

اسی درمیان ڈاکٹر ستیہ پال آنند اپنے دوست نند کشور وکرم کے ساتھ جوگندر پال سے ملاقات کی غرض سے وہاں آگئے۔کچھ دیر تک گفتگو ہوئی۔پھر چائے ناشتہ کے بعد وہاں سے رخصت ہو گئے۔دورانِ گفتگو ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے ایک سوال جوگندر پال کے سامنے پیش کیا۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند:۔ آج کل پوپ کہانیوں کا بڑا شور سُن رہا ہوں۔دراصل یہ ہے کیا؟

جوگندر پال:۔ ہاں میں نے بھی سُنا ہے۔میں اسے ایک الگ صنف کا درجہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا ہوں۔میرے خیال میں چھوٹی کہانیوں میں بھی کہانی پن ہونی چاہئے۔تیزی اور طنز کی کاٹ ہونی چاہئے۔اب چاہے کوئی اسے افسانچہ کہے، منی کہانی کہے، مختصر کہانی کہے یا پوپ کہانی کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

حق:۔ اُردو ادب کی جانب آپ کا رُجحان کیسے پیدا ہوا؟

جوگندر پال:۔ اُس وقت کا ماحول تھا لکھنا پڑھنا اردو میں اور بول چال پنجابی میں۔رسائل خرید کر پڑھنے کی حیثیت نہیں تھی۔اس لئے اپنے دوستوں کے ساتھ لائبریری چلا جاتا تھا۔وہاں اردو کے مختلف رسائل آتے تھے۔مجھے تو اب سب کے نام یاد نہیں۔ہاں! کچھ اہم رسالے تھے ادبِ لطیف، ادبی دُنیا، نقوش، نیرنگ خیال، ساقی وغیرہ۔بس ہم اُن رسالوں کے ہو گئے۔ہم دوستوں کا شغل تھا کہ اُن رسائل پر خوب بحثیں کرتے اور ادب کو جاننے کی کوشش کرتے۔بس اسی طرح اردو ادب سے رغبت پیدا ہو گئی۔

حق:۔ ہمیں بھی اُس زمانے کے اپنے دوستوں کے نام بتائیں۔

جوگندر پال:۔ میرے دوستوں میں سید جابر علی، کرشن موہن، م۔خ۔سامری اور ایم اسلم خاص تھے۔

محبوب حسن:۔ اُن رسائل میں کون سا رسالہ آپ کو سب سے زیادہ پسند تھا؟ اور کیوں؟

جوگندر پال:۔ ''ادبی دُنیا''، اس میں مضامین بہت اچھے آتے تھے۔

محبوب حسن:۔ آپ نے اردو کو ہی اپنا ذریعۂ اظہار کیوں بنایا؟

جوگندر پال:۔ دیکھئے سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اردو میں لکھنے کا شوق تھا۔اور پھر اُس دور میں پنجابی میں لکھنے کا Tradition بھی نہیں تھا۔

حق:۔ آپ کی سب سے پہلی کہانی کون سی تھی اور یہ کب اور کہاں چھپی تھی؟

جوگندر پال:۔ میری سب سے پہلی کہانی ''تیاگ سے پہلے'' تھی، جو ۱۹۴۵ میں مولانا شاہد احمد دہلوی کے رسالے ''ساقی'' میں شائع ہوئی تھی۔

حق:۔ افسانوں کا آپ کا پہلا مجموعہ کون سا تھا؟ اور یہ کب شائع ہوا تھا؟

جوگندر پال:۔ ''دھرتی کا کال''۔یہ ۱۹۶۱ میں شائع ہوا تھا۔

حق:۔ اس کے موضوع کیا تھے، اور اس کا پیش لفظ کس نے لکھا تھا۔؟

جوگندر پال:۔ میں اُس وقت افریقہ میں تھا۔چونکہ میں نہایت ہی غریب فیملی سے آیا تھا، اس لئے وہاں کی غربت نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔اس لئے اس کا موضوع قدرتی طور پر افریقی سماج تھا۔پیش لفظ کرشن چندر جی نے لکھا تھا۔

حق:۔ کیا آپ نے ڈائریکٹ اپنا مسودہ انھیں سونپا تھا یا کسی کی معرفت؟

جوگندر پال:۔ کرشن چندر سے میری ملاقات دہلی میں تھی۔وہ مجھ سے کافی سینئر تھے۔جب بھی چھٹیوں میں دلّی آتا اُن سے ملنے ضرور جاتا تھا۔اتنی



انسیت کے باوجود جب میں اپنا مسودہ لے کر اُن کے پاس گیا تو میرا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

حق:۔ کیا اس کتاب کا اجراء ہوا تھا؟ اگر ہاں تو کن کے ذریعہ؟

جوگندر پال:۔ میں نے اپنی کسی کتاب کا اجرا نہیں کرایا ہے۔

حق:۔ آپ کی کہانیوں کے موضوع کیا کیا ہیں؟

جوگندر پال:۔ کوئی موضوع نہیں۔ میں پہلے موضوع سوچ کر کہانیاں نہیں لکھتا۔ میرے Experience میرے اندر ہی اندر پکتے رہتے ہیں۔ تب میں اپنی نجات کے لئے بے چین ہو جاتا ہوں۔ پھر کہانی میری مدد کو آتی ہے اور مجھے Dictate کرانا شروع کر دیتی ہے۔ بس موضوع اپنے آپ بن جاتا ہے۔

حق:۔ اُس زمانے کے آپ کے ہم عصر اہم مصنف کون تھے؟

جوگندر پال:۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی اور ایم اسلم۔ قرۃ العین حیدر کو چھوڑ کر باقی سب ہم سے سینئر تھے۔

حق:۔ آپ کی نظر میں اُن سب میں سب سے بڑے مصنف کون تھے؟

جوگندر پال:۔ دیکھیے یہ آپ نے بڑا مشکل سوال کیا ہے۔ اپنے اپنے اسٹائل میں سب ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ اُن سبھوں نے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔

حق:۔ کیا اُن سبھوں سے آپ کی ملاقات رہی تھی؟

جوگندر پال:۔ جی ہاں! صرف منٹو کو چھوڑ کر۔ جس وقت میں پاکستان سے ہندستان آیا وہ پاکستان جا چکے تھے، اور پاکستان بننے کے بعد جب میں پہلی بار ۱۹۵۵ میں وہاں گیا اُن کا انتقال ہو چکا تھا۔

حق:۔ منٹو آپ کی نظر میں؟

جوگندر پال:۔ منٹو واقعی ایک عظیم فنکار تھا۔ منٹو کو منٹو اس لئے بنا دیا کہ اُنھوں نے ایسا کہ سچ مچ ہو گیا۔ اُن کی تخلیقات میں اُن کے ذاتی تجربوں و مشاہدوں کی تپش محسوس کی جا سکتی ہے۔ مجھے اُن کا کہانی کو ختم کرنے کا انداز بڑا پیارا لگتا تھا۔ اس معاملے میں وہ بہت کائیاں تھا۔

حق:۔ تخلیق اور تنقید میں کون برتر ہے؟

جوگندر پال:۔ دراصل دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ تخلیق کے دوران تنقید کا عمل جاری رہتا ہے اور تنقید بھی تخلیقی ہوتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ دونوں میں سے کون بڑا ہے۔ اس کو ہم الگ نہیں کر سکتے۔ دونوں عمل ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

محبوب حسن۔ کیا نقاد کی مدد کے بغیر کسی تخلیق کار کی تخلیقیت پروان نہیں چڑھ سکتی؟

جوگندر پال:۔ جی نہیں! میں یہ بات نہیں مانتا۔ کیوں کہ دور حاضر کے نقاد میں جو ایک بنیادی سچائی ہونی چاہئے وہ زیادہ تر ناقدوں میں نہیں ہے۔ وہ تعصب کی عینک سے تخلیقات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ وہ بغیر مصلحت کے کچھ بھی نہیں کہنا چاہتے۔ دراصل نقادوں میں جو ایک تخلیقی approach ہونی چاہئے وہ متعصب نقادوں میں ممکن نہیں۔ اس لئے وہ سچی تنقید کرنے سے قاصر ہیں۔ ان حالات میں صرف originality ہی کسی تخلیق کار کی تخلیقیت کو پروان چڑھا سکتی ہے۔

حق:۔ آج کل کے تقریباً ہر رسالے میں کتابوں پر تبصرہ شائع کرنے کا رواج عام ہے۔ اس روش کو آپ کیسا مانتے ہیں؟

جوگندر پال:۔ اچھا مانتے ہیں۔

حق:۔ تخلیقی اظہار کے لئے آپ کس کو ضروری سمجھتے ہیں؟

جوگندر پال:۔ تخلیقی اظہار کے لئے میں تخلیقیت کو ضروری سمجھتا ہوں، مشاہدے کو ضروری سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک کسی افسانے کی کوئی راہ متعین نہیں کی جاتی ہے کہ میں اس طرح کے افسانے لکھوں گا۔ بلکہ ہر کہانی اپنا راستہ خود آپ Dictate کرتی ہے اور ہمیں دریافت کرنا پڑتا ہے اُس کہانی کا طریقہ، وہ دریافت نہ کر سکے تخلیقی انداز سے، تو کہانی ہو ہی نہیں پاتی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ افسانے میں آپ کو بالکل بے نام اور گم رہ کے کہانی لکھنی ہوتی ہے اوروں کی۔ اگر آپ اوروں کی کہانی اس طرح جڑ کر لکھ سکیں کہ یوں لگے کہ آپ کے ساتھ سارا معاملہ بیت چکا ہے، تو تبھی دھڑکن پیدا ہوتی ہے تحریر میں۔ اہم بات یہ نہیں کہ آپ



نے افسانہ بڑی چالاکی سے لکھ لیا۔اہم بات یہ ہے کہ کیا آپ اُس کہانی کی واردات کو جی سکے؟ اگر آپ جی سکے ہیں ،تو کہانی آپ کی ہوگئی،ورنہ نہیں اور ایسا لگے کہ کہانی آپ کا حصّہ بن گئی۔محسوس ہو آپ کو کہ آپ نے اُسے جی لیا ہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو کہانی یقیناً اچھی نہیں ہوتی۔کہانی میں ہمیں محض رپورٹ نہیں کرنا ہوتا ہے کسی بات کو۔کسی واقعہ کو زندگی میں جو ہمارے ساتھ پیش آتا ہے اس لئے نہیں اہم سمجھتے کہ اُسے ہمیں رپورٹ کرنا ہے بلکہ وہ اس لئے اہم ہوتا ہے کہ ہمیں پیش آیا اور اُس نے ہمیں متاثر کیا۔

حق:۔اُن تمام مراحل کا تفصیلی تذکرہ کریں جن سے گذر کر آپ کی تخلیق صفحۂ قرطاس پر رقم ہوتی ہے؟

جوگندر پال:۔ کہانی لکھتے وقت مجھے کسی خاص ماحول یا موڈ کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔سب سے پہلے کوئی موضوع میرے ذہن میں دھیرے دھیرے پکتا رہتا ہے۔پھر پلاٹ اور کردار کی آنچ سے اُس میں اُبال آنا شروع ہوتا ہے،اور جب اُس کی تپش میری روح کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو کہانی عالمِ وجود میں آجاتی ہے۔کیوں کہ اُس وقت معاملہ میری اپنی نجات کا ہوتا ہے۔

حق:۔ آج کے بڑے اور مقبول افسانہ نگاروں میں خود آپ جوگندر پال، رتن سنگھ، انتظار حسین وغیرہ کی ادب میں کیا پوزیشن ہے؟

جوگندر پال:۔ یہ یقیناً آسان ہے آج سے ۲۵ سال پہلے کے لوگوں کے بارے میں سوچنا کہ بھئی اُن میں سے کون کون سے لوگ Survive کر گئے۔آج جو لوگ لکھ رہے ہیں اور جو آپ نے نام لیے بہت مشہور ہیں۔ہوسکتا ہے کہ اور دس سال کے بعد اُن کو کوئی نہ جانے۔یعنی جو وقت ہے نا وہ آپ کی کلاسیکیت کا سب سے بڑا ضامن ہے،اور آدمی جو فیصلہ کرلے کہ فلاں شخص کو بہت اُوپر لے جانا ہے، فلاں کو نیچے کرنا ہے تو اُس سے کچھ نہیں ہوتا۔وہ ہنگامی چیزیں ہیں،وہ ہنگامی اسباب ہیں۔ادب میں ہنگامی اسباب بالآخر کام نہیں کرتے۔آپ کی چیز اگر زندہ ہے،اُس میں دم ہے اور اُس میں کلاسیکیت ہے،اس اعتبار سے وہ رہ سکتی ہے۔بعض دفعہ آپ کو اپنے سارے دور سے لڑائی کرکے اپنے آپ کو زندہ رکھنا پڑتا ہے،بعض دفعہ آپ کی بڑائی میں آپ کا دور کام کر رہا ہوتا ہے،بعض دفعہ یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ فلاں آدمی کو اُونچا لانا ہے،بعض دفعہ آپ اتفاقیہ مشہور ہو جاتے ہیں۔تو ان ساری باتوں سے نکل کر جو شخص زندہ رہ جاتا ہے تو اُس کو زندہ رکھنے میں اُس کا کام ہوتا ہے اور وہ کام جو ہے وہ کسی کے ساتھ رعایت نہیں برتتا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ آج کے لوگ جو لکھ رہے ہیں اُن کا فیصلہ اور دس، بیس، پچیس سال میں ہوگا۔ آج ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ فلاں بھی لکھ رہا ہے اور وہ اچھا ہے،لیکن جیسے ہم پریم چند یا منٹو کے بارے میں سوچتے ہوئے اُنہیں دل میں بٹھا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر دور میں زندہ رہنے والے رائیٹر ہیں۔وہ مرتبہ حاصل کرنے والے کو آج بھی اُتنے دن ،اُتنے سال زندہ رہنا پڑے گا۔

محبوب حسن:۔آپ نے اب تک بیس بائیس کتابیں لکھی ہیں۔اُن کتابوں میں آپ سب سے اچھی کسے مانتے ہیں اور کیوں؟

جوگندر پال :۔(جذباتی انداز میں) آپ کسی باپ سے پوچھیں،نالائق بچّہ اُن کا بہت پیارا ہوتا ہے۔کیوں کہ اُسے سب سے زیادہ Protection اور Guidance کی ضرورت ہوتی ہے۔ویسے بھی کسی رائیٹر سے ایسا سوال نہیں کرنا چاہیے۔

محبوب حسن:سوری سر!اچھا یہ بتائیے کہ آپ کو اب تک کُل کتنے ایوارڈ ملے ہیں اور کب کب؟

جوگندر پال:۔میں نے کبھی ایوارڈ کو اہمیت نہیں دی ہے۔اب تو ٹھیک سے یاد بھی نہیں۔(کہہ کر وہ خاموش ہو جاتے ہیں)

پاس ہی اُن کی بیٹی مسز سوکرتی کھڑی تھیں،اُنہوں نے فوراً مجھے ایک لسٹ تھما دی جس میں اُن کو دیے گئے ایوارڈ کا ذکر تھا۔جس کے مطابق اُنہیں ۱۹۸۳ میں غالب ایوارڈ(غالب اِنسٹیٹیوٹ دہلی)، ۱۹۹۱ میں شرومنی ساہتیہ کار ایوارڈ (پنجاب سرکار)، ۱۹۹۶ میں آل انڈیا بہادر شاہ ظفر ایوارڈ (اردو اکیڈمی ،دہلی)،۱۹۹۹ میں اقبال سمان (مدھیہ پردیش،سرکار)، ۲۰۰۰ میں انجمنِ فروغ اردو ادب ورلڈ ایوارڈ، دوہا اور SAARC لائف ٹائم لٹریری ایوارڈ نئی دہلی کے ذریعہ دیے گئے تھے۔

حق:۔کسی بھی ادیب کیلئے انعامات کی کیا اہمیت ہے؟

جوگندر پال:۔ ادب میں ان ساری لغویات کی شروعات مصلحت پسندوں کی دین ہے۔ایک سچا فنکار ان خرافات سے بچ کر رہے تو لکھتا ہے۔میں یہ بھی مان لیتا ہوں کہ ایک عمر تک انعام کی خواہش جائز ہے،لیکن عمر بھر کے لئے اس لت کو پالنا گھٹیا پن کے سوا کچھ بھی نہیں۔اور اس گھٹیا ماحول میں ایک تخلیق کار بہتر سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔بڑے تخلیق کاروں کو شہرت کی خواہش گھٹیا بنا رہی ہے۔

حق:۔ برصغیر ہی نہیں ساری اردو دُنیا کو اس بات پر شدید حیرت ہے کہ قابلیت ہونے کے باوجود ابھی تک آپ کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے بھی نہیں نوازا گیا ہے؟ آپ اس کی کیا وجہ سمجھتے ہیں؟



جوگندر پال:۔ دیکھو بیٹا! جو جس چیز کی تمنا کرتا ہے ،اُس کے لئے کوششیں کرتا ہے، بھاگ دوڑ کرتا ہے، تو اُسے پانے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔میں نے ایوارڈ کی طرف رتی بھر دھیان نہیں دیا۔میں نے ایوارڈ کے لئے کبھی نہیں لکھا۔ ایوارڈ کے لئے نیچے تک اُتر جانا میں نے کبھی گوارہ نہیں کیا۔میرا کوئی حلقہ نہیں ہے۔میں نے اپنے میں مگن ہو کر ادب کی تخلیق کی ہے۔مجھے اس بات کا کوئی افسوس بھی نہیں ہے۔جب توقع ہی نہیں تو افسردگی کیسی؟

(میں نے سمجھا تھا کہ اس سوال پر جوگندر پال کافی Irritate ہو جائیں گے لیکن اس کے برعکس اُن کے چہرے پر جو آسودگی،اطمینان اور نرمی کے اثرات نمایاں تھے،میرے خیال میں بہت سے ایوارڈ یافتگان اس روحانی جذبے سے محروم ہوں گے۔)

حق:۔ آخر میں جاتے جاتے آپ آج کل کے تخلیق کاروں کے لئے کیا نصیحت کرنا چاہتے ہیں؟

جوگندر پال:۔ نصیحت نہیں بلکہ اُن کو میرا مشورہ ہے کہ کہانی لکھتے وقت اس بات پر دھیان دیں کہ وہ کسی بھی حالت میں کسی واقعہ کی Reporting نہ لگے بلکہ ایسا لگے کہ وہ آپ کے ساتھ بیتی ہو،اور ناگزیر طور پر بیتی ہو۔آپ نے اُسے بڑی ایمانداری سے نبھا دیا تو آپ نے اپنا کام کیا ورنہ چالاکی سے آپ اگر اُسے رپورٹ کر گئے تو کوئی اہم کام نہیں کیا۔لوگوں کی تکلیفوں کو اپنی تکلیفیں جان کر لکھو۔

کہانی باجے بجانے کیلئے نہیں لکھی جاتی اور جو باجے بجانے ہیں تو اور کئی طریقے ہیں اس کے لئے۔

اب دیکھئے ہماری اہم کہانیاں رہی ہیں جو ہمارے افسانہ نگاروں نے جی ،۔۔۔۔۔جی کر لکھی،اس لئے نہیں لکھی کہ انہیں اپنی تعریف کروانا مقصد تھا اور خوشی کے حیلے جو ہیں، وہ تلاش کرنے تھے۔بلکہ یہ کہ اُن کو دوسرے کے دکھ کو جینا تھا۔اوروں کے دُکھ کو جی پانا،اگر آپ میں یہ اہلیت ہے تو آپ ایک اچھے کہانی کار ہیں او رجو اوروں کا دُکھ نہیں جھیلتے آپ،اور دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ نے بہت اچھی کہانی لکھی،تو ایک چالاک کہانی تو اُس طرح ہو جاتی ہے۔لیکن دُکھ جھیلی ہوئی کہانی کی بات ہی الگ ہے۔ایسی کہانیوں میں لوگ اپنے آپ شریک ہو جاتے ہیں۔اگر لوگ۔۔۔بہت سے لوگ آپ کی تحریروں سے جُڑ جائیں تو یہ خوش قسمتی ہے آپ کی۔ ایک بات گانٹھ باندھ لیں۔کہانی کے کیریکٹر کے ساتھ جو پیش آتا ہے اُس کے دُکھ سکھ کو جینے کا انداز سیکھیں۔خاص کر دُکھ جھیلنے کا جذبہ پیدا کریں۔

(جوگندر پال کی تخلیقات کی روشنی میں مجھے اُن کا مشورہ اُن کی آپ بیتی لگی،اور میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا کہ آج عالمی سطح پر مشہور و مقبول افسانہ نگار نے اپنا Trade Secret بیان کر دیا ہے۔

حق:۔آپ نے اپنے اسٹوڈنٹ لائف میں ٹیوشن کی،پھر کینیا میں ٹیچر بنے،اُس کے بعد اورنگ آباد میں پروفیسر اور پرنسپل، اور آج بھی آپ اردو کے ادیبوں اور پروفیسران کو مسلسل پڑھا رہے ہیں۔کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ ۵/ستمبر کو ”ٹیچر ڈے“ کے دن پیدا ہوئے تھے۔

جوگندر پال:۔ (مسکراتے ہوئے) آپ بھی کہاں کہاں کی سوچتے ہیں حق صاحب۔

حق:۔ سر! آپ نے ہمیں اس طویل انٹرویو کے لئے اتنا وقت دیا ہے۔اس کے لئے ہم ہمیشہ آپ کے ممنون رہیں گے۔

جوگندر پال:۔کوئی بات نہیں بیٹے! خوش رہئے۔

نظریہ

لیجئے "عالمی انوارِ تخلیق" کا پہلا شمارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ فی الحال یہ کتابی سلسلہ ہندستان کے تین اہم موسموں کی مناسبت سے منظرِ عام پر آئے گا۔ اس لحاظ سے یہ شمارہ موسمِ گرما کا ہے۔ لیکن کچھ ناگزیر حالات کی وجہ کر اس پہلے شمارے کی اشاعت میں جو غیر معمولی تاخیر ہوئی ہے ہم اس کے لئے معذرت خواہ ہیں۔

دورِ حاضر میں تحریری ادب کے سامنے سب سے بڑا چیلنج بتدریج اس کی گھٹتی ہوئی ریڈرشپ ہے۔ خاص کر نوجوان طبقہ میں۔ اپنی تعلیمی ضروریات اور مجبوریوں کو چھوڑ کر اس طبقے میں ادب پڑھنے کا رُجحان زوال پذیر ہے۔ اب اُن کی رغبت انٹرنیٹ، فیس بک، whats app جیسی تفریحی دلچسپیوں سے بھرپور ذرائع کی جانب بڑی تیزی سے گامزن ہے۔

دراصل یہ کارپوریٹ یگ ہے۔ اس میں چیزوں کو نفیس اور دلکش انداز میں صارفین کو پیش کرنے پر ٹوئٹر، یوٹیوب، خاصی توجہ دی جاتی ہے۔ آپ بازار میں جدھر بھی نگاہ ڈالیں، اس کا جلوہ آپ کو چہار سو نظر آئے گا۔

آج لوگ اپنی ادا کی گئی رقم کی پوری قیمت وصول کر لینا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قارئین بھی کسی رسالے کو خریدنے سے پہلے یہ پوری طرح تسلی کر لینا چاہتے ہیں کہ اُن کی پائی پائی وصول ہونے کا امکان ہے یا نہیں۔

یہ خیال ہمارے ذہن میں کافی دنوں سے منڈلا رہا تھا کہ قارئین اب رسائل و جرائد میں ایک ہی نہج پر پروسے جانے والے تخلیقی مشمولات سے اُکتا گئے ہیں۔ اب انہیں کچھ نئی اور Attractive چیزیں ہی اپنی جانب راغب کر سکتی ہیں۔ اسی بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم نے اس کتابی سلسلے کو دلچسپ بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ کیوں کہ ادب کو اگر زندہ رکھنا ہے تو اسے نئی نسل سے جوڑنا ہوگا۔

گیند اب آپ کے پالے میں ہے اور ہمیں آپ کی آراء کا شدّت سے انتظار ہے۔

یاد رکھئے اثبت یا منفی ہر صورت میں آپ کا صرف ایک خط ہمارے لئے حوصلے اور مشعلِ راہ کی حیثیت رکھے گا۔

ہم "عالمی انوارِ تخلیق" کے سرپرستان کی اُردو دوستی، ادارتی بورڈ کے قابل ممبران کی والہانہ شمولیت کی رضامندی انتظامیہ کے دیگر عہدے داران کی کاوشوں کے ساتھ ساتھ اس شمارے کے تخلیق کاروں اور اشتہارات کی شکل میں تعاون کرنے والے اردو نوازوں کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں جن کی بے پناہ محبتیں اس شمارے میں جا بہ جا جلوہ گر ہیں۔

اور ہاں! ہم اس کتابی سلسلے کے سب سے مضبوط ستون اس کے "معاونین" کے لئے بھی اپنی ممنونیت کا اظہار کرتے ہیں جن کی فراخ دلی اور بے پناہ جوش نے اس کتابی سلسلہ کے تصوّر کو جلا بخشی ہے۔ معاونینِ عالمی انوارِ تخلیق کی بڑھتی ہوئی دلچسپی ہمارے اس خیال کو تقویت بخشتی ہے کہ اردو کا چراغ ابھی بجھنے والا نہیں ہے۔

ڈاکٹر ایم۔ اے۔ حق

(مدیرِ اعلیٰ)

ادب، میڈیا اور انٹرنیٹ

حیدر قریشی (جرمنی)
haider_qureshi2000@yahoo.com

ہم سب کا میڈیا سے شروع ہی سے ایک تعلق قائم رہا ہے اور اس تعلق کے ساتھ میڈیا سے ایک فاصلہ بھی رہا ہے۔ پرنٹ میڈیا میں کتاب کی صورت میں ادب کی اشاعت سے لے کر اخبار اور رسالوں میں ادب کی اشاعت تک ایک تعلق چھاپہ خانوں کی ابتدا سے چلا آرہا ہے۔ اور اخبار کی اہمیت و افادیت کے باوجود ادب نے صحافت سے اپنا الگ تشخص بھی شروع سے قائم رکھا ہے۔ اہلِ صحافت نے ادب کی جداگانہ شناخت کو کبھی اپنی عزت کا مسئلہ نہیں بنایا۔ یوں کئی شاعر اور ادیب کئی اخبارات و رسائل کے مدیران رہ چکے ہیں، اور کئی صرف مکمل صحافی حضرات بھی اخبارات و رسائل کے ایڈیٹرز رہ چکے ہیں۔ اس وقت بھی پرنٹ میڈیا میں یہ ملی جلی صورت دیکھی جاسکتی ہے۔ شاعر اور ادیب نہ ہوتے ہوئے بھی عام طور پر رسائل و جرائد کے مدیران میں زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب کی سوجھ بوجھ بھی معقول حد تک ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخبارات اور غیر ادبی رسائل میں بھی ادب کو مناسب جگہ ملتی رہتی ہے۔ ہر چند ادب ان کی پہلی یا دوسری ترجیح نہیں ہوتی پھر بھی ادب سے یکسر صرفِ نظر نہیں کیا جاتا۔ ادب اور صحافت کی دنیا میں ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ اور کاریگری کی روایات بھی شروع سے ملتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ادب میں شبلی نعمانی سے لے کر نیاز فتح پوری تک قمر زمانی بیگم اور ان سے ملتے جلتے فرضی قصوں کے ایپیسوڈز بھی دیکھے جاسکتے ہیں اور اخبار "فتنہ" اور "جواب فتنہ" جیسے تماشے بھی ریکارڈ پر موجود ہیں۔ ایک منفی رویہ ہونے کے باوجود ان سب واقعات میں ادب، آداب کی ایک تہذیب بھی ساتھ ساتھ چلتی رہی ہے۔ پھر ادب اور صحافت میں ایسے واقعات آٹے میں نمک کی مقدار سے بھی کم رہے ہیں۔ ان کے برعکس ہجو گوئی کی ایک روایت طویل عرصہ سے اردو ادب میں موجود ہے اور صحافت میں بھی شدید اختلاف رائے کی صورت میں اس کی کئی مثالیں مل جاتی ہیں۔ ان سب کچھ کے باوجود ادب اور پرنٹ میڈیا کے درمیان ایک فاصلہ اور ایک ہم آہنگی ہمیشہ سے موجود رہی ہے اور اس خاص نوعیت کے تعلق میں ایک باوقار طریق کار صاف دکھائی دیتا ہے۔

پرنٹ میڈیا کے بعد جب ریڈیو کے ذریعے ہوا کے دوش پر صحافت کے فروغ کی صورت نکلی تو اس میں ادب کا بھی تھوڑا بہت حصہ ہمیشہ شامل رہا ہے۔ ریڈیو سے سرکاری ٹی وی کے دور تک بھی اس روایت کو تھوڑی بہت ہیرا پھیری اور جانبداری کے ساتھ سہی لیکن پھر بھی قائم رکھا گیا۔ سرکاری ٹی وی نے اسٹیبلشمنٹ کے منظورِ نظر یا پھر متعلقہ ٹی وی حکام کے پسندیدہ ادیبوں کو نمایاں کیا۔ اس دور میں "میڈیا کر" رائٹرز کی باقاعدہ کھیپ تیار کی گئی۔ معیاری تخلیقی ادب کو عام طور پر نظر انداز کیا گیا۔ میڈیا کر رائٹرز بے بغیر ادب کی خاموشی کے ساتھ خدمت کرنے والوں کو نظر انداز کیا گیا۔ تاہم یہاں ادب کے نام پر جو کچھ پیش کیا گیا اس کی میڈیائی ضرورت کو اہمیت اور اولیت دینے کے باوجود اس میں ادب کا ایک کم از کم معیار بہر حال ملحوظ رکھا گیا۔ اس دورانیہ میں بعض ادیبوں کے مختلف نوعیت کے منفی رخ اور منفی کام بھی سامنے آئے لیکن ان کی مقدار آٹے میں نمک کے برابر رہی۔

یہاں تک پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر ادب کے حوالے سے جو کچھ پیش کیا جاتا رہا، اس کے دوش بدوش بلکہ اس سب سے ایک قدم بڑھ کر ادبی رسائل بھی اپنا کردار ادا کرتے رہے۔ بے شک اختلاف رائے رکھنے والے رسائل کے درمیان شدید اختلاف بھی نمایاں ہوا، ادبی مسابقت کی دوڑ میں، ان جرائد میں قارئین کی آراء کے ذریعے مدیر ہی کے موقف کو ابھارنے کی دیدہ دانستہ کاوشیں بھی ہوئیں۔ ادبی فیصلوں میں ڈنڈی مارنے کا رجحان بڑھا، اس کے باوجود ادبی رسائل کا ادب کے فروغ کا مجموعی کردار اتنا موثر تھا کہ ادبی دنیا کی چھوٹی موٹی کوتاہیاں قابلِ معافی بن جاتی تھیں۔

نئے ہزاریے کی پہلی صدی کے آغاز کے ساتھ سیٹلائٹ کے ذریعے ٹی وی چینلز کی بہار اور یلغار آئی تو ساتھ ہی انٹرنیٹ کے ذریعے اشاعت کے وسیع تر مواقع میسر آگئے۔ سیٹلائٹ نے پرائیویٹ چینلز کی بھرمار کردی۔ چینل مالکان کے درمیان ریٹنگ کی دوڑ شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے خبروں کو پیش کرنے کی ہوڑ میں مصدقہ اور غیر مصدقہ کا فرق ہی نہ رہنے دیا گیا۔ جو آگے نکل جاتا ہے خبر کو سب سے پہلے پیش کرنے پر بار بار فخر کا اظہار کرتا ہے اور جو پیچھے رہ جاتا ہے وہ اپنی ناکامی کو اپنی صحافیانہ اخلاقیات کا نمونہ بنا کر بیان کرنے لگتا ہے۔ جس قوم کو کسی اہلِ نظر کی رہنمائی کی ضرورت تھی اسے خبروں اور ان پر مختلف النوع تبصروں کے جال میں پھنسا دیا گیا ہے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

"بلندی دیر تک کس شخص کے حصے میں رہتی ہے
بہت اونچی عمارت ہر گھڑی خطرے میں رہتی ہے"
منور رانا 09415020167 (مجموعہ کلام "ایک سو غزلیں")

زمانے کی رفتار میں تیزی آئی تو میڈیا نے اس رفتار کو تیز تر کر دیا۔ بے شک اتنی باخبری مہیا کر دی گئی ہے کہ انسان بے خبری کو ترس کر رہ گیا ہے۔ اس کے بہت سے سماجی فائدے بھی ہوئے ہیں لیکن اس کے فائدوں کے مقابلہ میں ہونے والے دور رس نقصانات کہیں زیادہ ہیں۔ اس سے صحافت میں بلیک میلنگ کا ریٹ بھی آسمان تک جا پہنچا ہے۔ میڈیا جس کرپشن اور معاشرتی لُوٹ کھسوٹ کا سب سے زیادہ شور مچاتا ہے خود اس کے اپنے کئی مالکان اور کئی میڈیا اسٹارز نہ صرف ہر طرح کی اخلاقی و غیر اخلاقی کرپشن میں ملوث ہیں بلکہ ٹیکس چوری کلچر کو فروغ دے کر خود بھی اسی لوٹ کھسوٹ کا حصہ بنے ہوئے ہیں، جس کے خلاف بظاہر دن رات احتجاج کر رہے ہوتے ہیں۔ ایک طرف میڈیا کی آزادی کے علمبردار بننے کا دعویٰ کرتے ہیں دوسری طرف ''آزادی'' کی حد اتنی ہے کہ مذہبی دہشت گردوں کے سامنے سراپا احتیاط بنے ہوتے ہیں۔ سلمان تاثیر کو دن دہاڑے شہید کر دیا گیا اور میڈیا کو جرأت نہ ہوئی کہ ان کے نام کے ساتھ شہید کا لفظ بول سکتا۔ دہشت گردوں کے بارے میں کھل کر بات کرتے ہوئے ہر کوئی احتیاط کرتا ہے لیکن ان کی وکالت کرنے والے کسی اگر مگر کے بغیر انہیں ''ہمارے'' قرار دے کر انہیں بے قصور ظاہر کرتے ہیں۔ یہ سماجی سطح پر میڈیائی رویے کی ہلکی سی جھلک ہے۔ ٹی وی کے تجزیاتی پروگرام تجزیہ کم اور ذاتی خواہشات کے آئینہ دار زیادہ ہوتے ہیں۔ نقالی کا رجحان میڈیا کے غیر تخلیقی ارکان کی ذہنی صلاحیت کو تو بخوبی اجاگر کرتا ہے لیکن اس رجحان کے باعث بعض تخلیقی اذہان بھی نقلِ محض بن کر رہ گئے ہیں۔ کسی ایک چینل پر کوئی حالاتِ حاضرہ کا پروگرام اپنے کسی خاص انداز کی وجہ سے کامیاب لگنے لگتا ہے تو حقائق تک رسائی حاصل کیے بغیر دوسرے چینلز بھی ملتے جلتے انداز کے پروگرام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مارننگ شوز، کرائمز رپورٹس پر مبنی پروگرامز، معاشرتی مسائل، جادو ٹونے اور جنات کے موضوعات سے لے کر کامیڈی شوز تک مسلسل نقالی کا رجحان دیکھا جا سکتا ہے۔ کامیڈی شوز میں پنجابی اسٹیج شوز کا عامیانہ پن پوری طرح سرایت کر گیا ہے۔ پنجابی اسٹیج شو میں تھوڑی سی اصلاحِ احوال کی ضرورت تھی۔ مثلاً رشتوں کی تذلیل کرنے کی بجائے ان کے احترام کو ملحوظ رکھنا، ہر کسی کا تمسخر اڑانے کی بجائے، اور جسمانی عیوب کی تضحیک کرنے کی بجائے معاشرے کے حقیقی معائب پر طنز کرنا اور مزاح کی صورت میں بھی دوسروں کو نشانہ بنانے کی بجائے خود کو زد پر رکھنا جیسی تبدیلیاں کر لی جائیں تو پنجابی اسٹیج شو آج بھی عالمی معیار کا تھیٹر بن سکتا ہے۔ ٹی وی چینلز نے پنجابی تھیٹر کے فنکاروں کی پوری پوری فوج اپنے شوز میں بھرتی کر لی لیکن اصلاحِ احوال کی طرف کسی اینکر نے بھی توجہ نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج مختلف چینلز کے مزاحیہ شوز عمومی طور پر ویسا منظر پیش کر رہے ہیں جیسا ہندوستان کی بعض مسلمان ریاستوں کے زوال کے وقت ان معاشروں میں وہاں کی تہذیب کے نام پر انتہا درجہ کی پھکڑ بازی رائج ہو چکی تھی۔ خدا نہ کرے کہ یہ سارے ٹی وی شوز پاکستان کے کسی تہذیبی یا جغرافیائی زوال کی علامت بن جائیں۔ اور بعد میں ان ٹی وی شوز کی تہذیب کی بنیاد پر اس قومی زوال کی کہانی کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ بہتر ہوگا کہ ایسے پروگراموں کے اینکرز نقل در نقل کی لہر میں ہر کسی کی تذلیل کرنے کی بجائے شائستہ مزاح کے لیے محنت کر سکیں۔ کیا دوسروں کی تذلیل و تضحیک کیے بغیر شائستہ مزاح پیدا نہیں کیا جا سکتا؟۔ بہتر ہوگا کہ اپنے تمام تر علم و فضل کے باوجود کامیڈی شوز کے اینکرز حضرات پہلے طنز و مزاح سے متعلق بنیادی لٹریچر کا مطالعہ کر لیں۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں اسی بہانے اپنی بعض شخصی کمزوریوں کا ادراک ہو جائے اور وہ ان پر قابو پا کر اپنے شوز کو بلیک میلنگ اسٹائل کی بجائے سچ مچ کے مزاحیہ پروگرام بنانے میں کامیاب ہو جائیں۔

سیٹھ کی پسند اور اپنے حکام کی پسند کو ملحوظ رکھتے ہوئے جن میڈیا گر دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کو قوم کا ترجمان بنایا تھا، اس بوئی ہوئی فصل کو کاٹنے کا وقت آیا تو آزاد میڈیا نے اس نوعیت کے میڈیا گر دانشوروں کے بھی نمبر دو قسم کے دانشوروں کی کھیپ تیار کر لی۔ اور اب ایسے دانشوروں کی اتنی کھیپ تیار ہو چکی ہیں کہ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ پرائیویٹ چینلز پر تلفظ کی فاش نوعیت کی غلطیاں اپنی جگہ، اشعار کو انتہائی برے انداز سے مسخ کر کے اور مکمل بے وزن کر کے پڑھتے ہوئے بھی یہ نئے میڈیا گر دانشور اتنے پُر اعتماد دکھائی دیتے ہیں کہ بندہ یہی سوچتا رہ جاتا ہے کہ اگر یہ ادب ہے تو پھر واقعی ادب کی موت ہو چکی۔ اتنے چینلز کی بھرمار کے باوجود ایک بھی چینل ایسا نہیں جہاں زیادہ معیاری نہ سہی کم از کم پی ٹی وی کے پرانے معیار کے ادبی پروگرام ہی پیش کیے جا سکیں۔

انٹرنیٹ کی دنیا اتنی وسیع تر اور گلوبل ولیج کی بھرپور ترجمان ہے کہ اس کے مثبت فوائد کو جتنا اپنایا جائے اس میں خیر ہی خیر ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ہماری اردو دنیا نے اس کے بہت سارے مثبت فوائد سے اچھا استفادہ کیا ہے۔ اردو کی متعدد لائبریریوں کا قیام، ان لائبریریوں میں دینیات سے لے کر ادب اور سائنس تک مختلف موضوعات کی کتب کی آسان فراہمی ایک مثبت پیش رفت ہے۔ ہر چند اس میدان میں ابھی بہت کچھ کیا جانا باقی ہے لیکن جتنا کچھ دستیاب ہے وہ بھی اپنی جگہ نعمتِ خداوندی ہے۔ نعمتِ خداوندی کے الفاظ میں نے یونہی نہیں لکھ دیے۔ والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ ان کے بزرگوں کے زمانے میں بخاری شریف کی زیارت ہو جانا ہی بہت بڑی سعادت اور بہت بڑا کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔ کہاں سو، سوا سو سال پہلے کا وہ زمانہ اور

کہاں آج کی دنیا کہ بخاری شریف سمیت حدیث کی ساری کتب آن لائن دستیاب ہیں اور ان کے اردو ترجے بھی موجود ہیں۔قرآن شریف کے مختلف تراجم کی دستیابی کے ساتھ قرات سکھانے کا خودکار نظام تک مہیا کردیا گیا ہے۔یہی صورت حال دوسرے مذاہب کی کتب مقدسہ کے معاملہ میں ہے۔دینیات سے ہٹ کر دوسرے موضوعات کے حوالے سے کسی نوعیت کی تعلیمی ضرورت یا تحقیقی کام کے لیے مطلوب ہر قسم کا مواد عموماً انٹرنیٹ پر مل جاتا ہے۔صحت مند تفریح کا سامان بھی موجود ہے۔معلوم انسانی تاریخ میں معلومات کی اتنے وسیع پیمانے پر فراہمی اتنی آسان اور اتنی ارزاں کبھی نہیں تھی۔انٹرنیٹ پر کوئی بھی سنجیدہ اور با معنی کام کرنے والوں کے لیے اپنے بلاگس بنانے سے لے کر اپنی ویب سائٹس بنانے تک کی سہولیات موجود ہیں۔اردو میں لکھنے کی سہولت بھی عام کردی گئی ہے۔مختلف ٹی وی چینلز جو ہر جگہ نہیں دیکھے جاسکتے انٹرنیٹ کے ذریعے ان کی دستیابی بھی آسان ہو چکی ہے۔موبائل فون پر ساری انٹرنیٹ سروسز کا مہیا کردیا جانا بجائے خود ایک حیران کن کام ہے جو اب معمولاتِ زندگی میں شمار ہوتا ہے۔

اس قسم کی مزید ہزار ہا خوبیاں ہیں جو انٹرنیٹ کی برکت سے ہر خاص و عام کے لئے دستیاب ہیں۔لیکن ان سب کے دوش بدوش ایک ایسی خرابی بھی انٹرنیٹ پر موجود ہے جو کم از کم ہمارے معاشرے اور ہمارے ماحول کے لیے انتہائی تباہ کن ہے۔سوشل میڈیا کے نام پر فیس بک،ٹویٹر اور یوٹیوب سے لے کر مختلف ٹی وی شوز کو پیش کرنے والے انٹرنیٹ ٹی وی نیٹ سروسز تک میں آزادیٔ اظہار کے نام پر نجی تاثرات دینے کے جو تماشے لگے ہوئے ہیں،وہ گھٹیا پروپیگنڈہ کے باعث محض دل کی بھڑاس نکالنے کے ٹھکانے بن کر رہ گئے ہیں۔ایسے ٹھکانے جہاں بعض اوقات بازاری زبان اور گالی گلوچ کی سطح سے بھی زیادہ گھٹیا زبان کو استعمال کیا جارہا ہوتا ہے۔مذہبی،فرقہ وارانہ،سیاسی،ادبی اور دیگر مختلف سماجی گروہوں کی اختلافی سرگرمیاں اظہارِ رائے کی تمیز اور تہذیب کے ساتھ چلتیں تو معاشرے کے لیے خیر کا موجب بن سکتی تھیں۔لیکن جہاں مذہب اور فرقوں کے نام پر غلیظ ترین زبان استعمال کی جاتی ہو اور انتہائی ذلیل ترین حرکات کا مظاہرہ کیا جاتا ہو،وہاں زندگی کے باقی شعبوں میں کسی خیر کی صورت دیکھنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔اظہار رائے کی یہ مادر پدر آزادی سوشل میڈیا کے کسی بھی فورم پر دیکھی جاسکتی ہے۔اس آزادی کا ایک سخت مگر ایک لحاظ سے دلچسپ اثر اخبار اور ٹی وی پر دیکھنے کو ملا۔میں نے دیکھا کہ دوسروں پر بہت زیادہ با اصول بنتے ہوئے بے اصولی تنقید کرنے والے ٹی وی اینکرز سوشل میڈیا پر اپنے بارے میں دیئے جانے والے گالیوں والے ردِعمل پر مایوس تھے اور بعض ایسے ردِعمل سے اس حد تک دل برداشتہ تھے کہ یہ کام چھوڑ کر کسی دیہات میں بس جانے کا ذکر بھی کر رہے تھے۔ادب میں پرانے زمانے میں ایسے قبیلے موجود رہے ہیں جو قلمی غنڈہ گردی کرتے ہوئے خود سے اختلاف کرنے والوں کے خلاف گم نام مراسلہ بازی کیا کرتے تھے اور اس مراسلہ بازی میں انتہائی لچر اور فحش زبان استعمال کی جاتی تھی۔اسی طرح کے ایک ادبی قبیلے کے ایک کالم نگار کو میں نے دیکھا کہ وہ اپنے کالم میں اخلاقیات کی دہائی دے رہے تھے۔مجھے اس قبیلے کی کئی پرانی سرگرمیاں یاد آئیں اور مجھے ایک پل کے لیے یہ سب اچھا لگا کہ مکافاتِ عمل کی ایک صورت دیکھنے کو ملی۔لیکن یہ سب تو شاید میرے لیے کسی حد تک ذاتی نوعیت کی خوشی ہو سکتی تھی۔جس سے کچھ دیر کے بعد میں خود بھی شرمندہ ہوا۔اگر ادبی تہذیب کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ سب شرمناک تھا اور میں بہرحال سوشل میڈیا کی مادر پدر آزادی کے باعث گندی زبان کے استعمال کی مذمت کروں گا۔

سوشل میڈیا پر جو چیز بہت زیادہ مقبول ظاہر کی جاتی ہے،بعض استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر عموماً یہ مقبولیت مصنوعی اور خود ساختہ ہوتی ہے۔مختلف گروہوں نے اپنی انٹرنیٹ ٹیمیں تشکیل دے رکھی ہیں جو ایک سے زیادہ اکاؤنٹس بنا کر "کمپنی کی مشہوری" کرتے رہتے ہیں۔اس مصنوعی گیم کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے صرف ٹاپ کی دو مثالیں پیش کروں گا۔پاکستان کی دو شخصیات سوشل میڈیا کی سب سے مقبول شخصیات تھیں۔پہلے نمبر پر سابق صدر جنرل پرویز مشرف اور دوسرے نمبر پر سابق کرکٹر اور آج کے ایک سیاسی لیڈر عمران خان۔سوشل میڈیا پر اپنی سب سے زیادہ مقبولیت کے دھوکے میں جنرل پرویز مشرف بے تاب ہو کر لندن سے پاکستان پہنچ گئے۔اور پھر جلد ہی قانونی موشگافیوں کی زد میں آکر قیدِ تنہائی میں ڈال دیئے گئے۔عمران خان اپنی انٹرنیٹ مقبولیت کے بل پر ایک بال سے دو مضبوط وکٹوں کو گرانے نکل کھڑے ہوئے اور بڑی مشکل سے اور دوسروں کی مدد لے کر صرف ایک صوبے میں حکومت بنا پائے۔سوشل میڈیا میں سیاسی اور سماجی سطح پر مقبولیت کا بھرم کھولنے کے لیے اور اصل حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ دو مثالیں کافی ہیں۔

سوشل میڈیا کے ذریعے جرائم کی نت نئی ترکیبوں کے سلسلے بھی سامنے آنے لگ گئے ہیں۔سماجی سطح پر کتنے ہی گھران روابط کے باعث نہ صرف ٹوٹے ہیں بلکہ تباہ ہو کر رہ گئے ہیں۔جنسی بے راہروی اور بلیک میلنگ سے اغوا برائے تاوان تک کتنے ہی جرائم ہوتے چلے جارہے ہیں۔ادبی لحاظ سے بھی سوشل میڈیا پر کوئی خوش کن صورت حال دکھائی نہیں دیتی۔ایک طرف تو بے وزن شاعروں کی بھرمار ہے اور انہیں داد دینے کا وسیع سلسلہ بھی مربوط طور پر دکھائی دیتا ہے۔دوسری طرف جینوئن ادیبوں کی اپنی اپنی ٹولیاں اور مدح سرائی

"سرِ سخن لپیٹنے والوں کے پاس اب [illegible] چادر ہی صرف رہ گئی سر اب نہیں رہے۔"
اسلم [illegible] 09631476773 (سہ ماہی "ابجد" اریہ جولائی تا دسمبر 2013)

کے بچکانہ سلسلے ہیں۔ان فورمز کا ایک فائدہ ضرور ہوا ہے کہ کئی ایسے شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں جو یہ تاثر موجود تھا کہ وہ شہرت سے بے نیاز ادبی کام کرنے کی لگن میں مگن رہتے ہیں۔یہاں ان کی بے نیازیوں کے بھرم کھلے ہیں۔اور شہرت کے حصول کے لیے ان کی جانب سے ایسی ایسی مضحکہ خیز حرکات دیکھنے میں آئی ہیں کہ اپنے ادیب کہلانے پر بھی شرمندگی سی ہونے لگتی ہے۔یہاں ادب سے تعلق سے دو نسبتاً معقول واقعات کا ہلکا سا اشارہ کرنا چاہوں گا۔

فیس بک پر بعض ادیبوں نے اپنے الگ الگ فورمز بھی بنا رکھے ہیں۔ایک فورم پر اعلان کیا گیا کہ یہاں ایک شاعر کی نظم پیش کی جایا کرے گی اور اس پر سیر حاصل گفتگو ہوا کرے گی۔پھر ان ساری گفتگو کو فلاں ادبی رسالہ میں شائع کر دیا جایا کرے گا۔پہلے ایک دو دوسرے شعراء کی نظمیں پیش ہوئیں،ان پر بات بھی چلی۔اس کے بعد زیر گفتگو رسالہ کے مدیر نے اپنی نظم پیش کی۔اس میں لوگوں نے زیادہ دلچسپی نہ لی۔کوئی خاص گفتگو نہ ہو پائی۔نتیجہ یہ ہوا کہ جو مکالمہ رسالہ میں شائع کیے جانے کا اعلان کیا گیا تھا،وہ شائع نہیں کیا جا سکا۔ایک اور شاعر نے اپنے نام کے بغیر نظم پیش کی تو بعض قارئین نے اسے سنجیدگی سے نہیں لیا۔بعض نے ہلکا سا مذاق اُڑا لیا۔اس پر شاعر موصوف نے اپنے نام کے ساتھ قارئین کو بتایا کہ آپ جس شاعر کی نظم پر ایسی رائے دے رہے ہیں،اگر آپ کو اس کا نام معلوم ہو جائے تو آپ سب کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ جائیں گے۔اس پر قارئین نے تقاضا کیا کہ شاعر کا نام بتائیں،انہوں نے اپنا اسم گرامی بتایا کہ یہ میری نظم ہے۔اور پھر انہوں نے دیکھا کہ ان کے انکشاف کے بعد بھی قارئین کے رویے میں کوئی فرق نہ آیا اور پھر فیس بک کے قارئین کے رویے پر خود ان کا اپنا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ مذکورہ دونوں نظم نگار نظم کے اچھے شاعر ہیں۔لیکن اپنی تمام تر بے نیازی کے باوجود فیس بک پر مقبولیت کے شوق میں انہیں تیسرے درجہ کا ادبی شعور رکھنے والوں کے ہاتھوں تمسخر کا نشانہ بننا پڑا۔

میڈیا کی کروڑوں کی طرح سوشل میڈیا نے بھی اپنی قماش کے شاعروں کی ایک کھیپ پیدا کی ہے۔ان میں بعض اچھے شعر کہنے والے شاعر بھی موجود ہیں۔تاہم یہاں ان کی عوامی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ جب ان کی کوئی غزل فیس بک پر سجائی جاتی ہے تو سات اشعار پڑھے جانے کے ٹائم سے بھی پہلے ہی اس غزل کی تعریف میں سات قارئین (عموماً خواتین) کی جانب سے اسے پسند کرنے کے ریمارکس آجاتے ہیں۔اور دمبدم ان کی مقبولیت بڑھتی چلی جاتی ہے۔یہاں مجھے ایک پرانے مزاحیہ پروگرام "ففٹی ففٹی" کا ایک لطیفہ یاد آگیا ہے۔پروگرام میں ایک میوزیم دکھایا جاتا ہے۔اس میوزیم میں موجود ایک قلم پر بات ہوتی ہے۔گائیڈ بتا رہا ہوتا ہے کہ اس تاریخی قلم سے پروگرام "ففٹی ففٹی" کی تعریف میں دس ہزار خطوط لکھے گئے ہیں۔اور پھر مزید وضاحت کرتا ہے کہ یہ قلم "ففٹی ففٹی" کے پروڈیوسر کا ہے۔"ففٹی ففٹی" والوں کا لطیفہ سو فی صد حقیقت کی صورت میں فیس بک کے "مقبول ترین شاعروں" میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ادب اور صحافت کے حوالے سے میں شروع میں ہی قمر زمانی بیگم اور اخبار "فتنہ" اور "جواب فتنہ" کا ذکر کر چکا ہوں۔سوشل میڈیا کے جن معائب کا میں نے ذکر کیا ہے،وہ سب ادب سمیت ہمارے پورے معاشرہ میں کسی نہ کسی رنگ میں موجود رہے ہیں۔تاہم ان سب کی مقدار آٹے میں نمک کی طرح رہی ہے۔سوشل میڈیا پر خرابی یہ ہوئی ہے کہ یہ سارے معائب اور ساری خرابیاں اس حد تک بڑھ گئی ہیں کہ نمک میں آٹے والی صورت بن گئی ہے۔پرانی برائیوں کو بڑے پیمانے پر دہرانے کے ساتھ ہم نے کئی نئی برائیاں بھی ایجاد کر ڈالی ہیں۔وہ ساری ایجادیں سوشل میڈیا سے ہوتی ہوئی ہمارے پورے معاشرے میں سرایت کرنے لگی ہیں۔

ان ساری برائیوں کا عام طور پر اور ادبی خرابیوں کا خاص طور پر تدارک کرنے کے لیے ایک تجویز میرے ذہن میں آتی ہے۔سوشل میڈیا پر کسی بھی فورم کی رکنیت کے لیے اس ملک کے شناختی کارڈ کے مطابق اس کے نمبر کا اندراج لازم کیا جانا چاہیے۔اور ہر فورم پر ایک شناختی کارڈ پر ایک اکاؤنٹ کھولنے کی پابندی لگ جائے۔ اگر شناختی کارڈ کے نمبر کے بغیر کسی کو بھی اکاؤنٹ کھولنے کا موقعہ نہ ملے،اور پہلے سے موجود اکاؤنٹس کو بھی شناختی کارڈ نمبر کے ساتھ مشروط کر کے ری فریش کیا جائے تو پہلے مرحلہ میں پچاس فی صد سے زائد اکاؤنٹ غائب ہو جائیں گے۔غائب ہونے والے اکاؤنٹس کی شرح پچاس فی صد سے زائد ہو سکتی ہے،کم ہرگز نہیں ہوگی۔اس تجویز کو میں نے سادہ انداز میں بیان کیا ہے۔حکومتی سطح پر تکنیکی ماہرین اسے مزید غور کر کے زیادہ موثر بنا سکتے ہیں۔

ادب ہو یا زندگی کا کوئی اور شعبہ ہو،اختلاف رائے کے اظہار کا حق ہر کسی کو ملنا چاہیے۔اس پر کوئی ناروا پابندی لگے تو اس کی مزاحمت کی جانی چاہیے۔لیکن چوروں کی طرح چھپ کر وار کرنے والوں اور اختلاف رائے کے نام پر انتہائی شرمناک قسم کی گالیاں بکنے والوں کو اس سے باز رکھنے کے لیے،ان کی شناخت واضح ہونی چاہیے۔اگر پاکستان آغاز کرے اور جنوبی ایشیا کے ملکوں کو ساتھ لے کر عالمی سطح پر حکومتوں کو متحرک کیا جائے تو شناختی کارڈ نمبر کی بنیاد پر سوشل میڈیا کے فورمز کی رکنیت کو مشروط کر کے سائبر ورلڈ کے ان سارے فورمز کو زیادہ مہذب،بہتر اور موثر بنایا جا سکتا ہے۔خرابیاں یکسر ختم نہیں ہوں گی لیکن ان میں خاطر خواہ کمی ہوگی اور انٹرنیٹ کی اس جدید تر دنیا میں ہم سب کو اپنی خامیوں پر قابو پا کر بہتر اور صحت مند کردار ادا کرنے کا موقعہ ملے گا۔تب ہم سب اس گلوبل ولیج کے اچھے شہری بن سکیں گے۔

"عروض کے میدان میں کمال صاحب یکتا ہیں۔ اُس زمانے میں چند ہی بڑے عروضی ہوئے ہیں، سحر عشق آبادی، رزار علامی، گیان چند اور کمال احمد صدیقی۔"
شمس الرحمٰن فاروقی۔ 09450615881 "مضمون" کمال احمد صدیقی" (خبرنامہ شب خون اکتوبر تا دسمبر 2013)

(انشائیہ)

بیماری ایک نعمت

امجد مرزا امجد (لندن)
007939830093
mirzaamjad@hotmail.co.uk

آج کل اگر کوئی بیمار نہ ہو تو اُسے رشک کی بجائے شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ اس پر کسی خاص "وائرس" کا حملہ تو نہیں ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد اس کے گھر والے بھی پوچھے بنا نہیں رہتے "بیٹے! تم ٹھیک تو ہو نا؟"

بیماری بھی ایک طرح کی بیماری ہے کئی لوگوں کو بیمار رہنے کی بیماری ہوتی ہے، جیسے میری ایک رشتہ دار خاتون کو یہ بیماری لاحق ہے کہ وہ ہر وقت بیمار رہتی ہیں۔ گھر کا سارا کام، بازار کی تمام شاپنگ، بچوں کو اسکول لے جانا لے آنا اور تو اور گھر کی چھوٹی موٹی مرمت یا رنگ روغن بھی خود کرتی ہیں۔ مگر جب پوچھو "آنٹی جی! کیا حال ہے" حلق کے کنویں سے ہلکی سی آواز آئے گی

"میں ٹھیک نہ!"

اب انہیں جانتے ہوئے چالیس سال سے اوپر تو ہو ہی گئے ہیں جو بیچاری اتنی مدت تک مسلسل بیمار رہی اور ٹھیک نہ ہو سکی اسے کب ہونا ہے اور اس سے زیادہ بیمار ہو گا بھی کون؟

بیمار ہونے کے فوائد بھی ان گنت ہیں، شاید اسی لئے اکثر لوگ بیمار رہتے ہیں۔ آدمی جوں ہی سر باندھ کر لیٹ جائے سارے گھر والے اس کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں اور لگ جاتے ہیں خاطر مدارت میں، چاہے بیٹے نے ایک دن قبل ماں کی چوڑیاں بیچ جوئے میں ہار دی ہوں مگر بیمار پڑتے ہی ماں اس کی بلائیں لینے لگے گی "ہائے میرے لال تو جیسا بھی ہے تندرست ہو جا، اللہ تیرے سارے دکھ مجھے لگ جائیں" یہ تو خیر ممتا کی محبت کا تقاضا ہے مگر ماموں چچے اور دوسرے رشتہ دار بھی جو اس کمبخت کی شکل سے نالاں ہوں جوس اور "لوکوزیڈ" کی بوتلیں اٹھائے آ رہے ہیں اور طرح طرح کے پھل کاٹ کاٹ کر زبردستی اس کے منہ میں ٹھونس رہے ہیں کہ مبادا بیٹے کو کمزوری نہ ہو جائے۔

بیمار کو اٹھانا ہو تو پورا گھر کیا سارا محلہ اکٹھا ہو جاتا ہے کہ کمزور ہے آرام سے اٹھانا کہیں کوئی ٹھیس نہ لگ جائے، ایک چھٹانک بھر کے مریض کو اٹھانے کے لئے بارہ بارہ ہاتھ بیقرار ہونے لگتے ہیں۔ ایسے کو پھر اللہ ہی اٹھاتا ہے اور برادری محلے کا ہر کوئی کہہ اٹھتا ہے "اللہ اللہ کیسے اٹھا بے چارا... پتہ ہی نہ چلا...!"

مریض اور دلہن نئے نئے ہوں تو بہت قدر ہوتی ہے جوں جوں یہ دونوں پرانے ہوتے جاتے ہیں گھر والوں کی جان کے روگ بنتے جاتے ہیں۔

بیمار سے دعا بھی کرائی جاتی ہے کہ سنا ہے اللہ اس کی دعا قبول کرتا ہے مگر دوسروں کے لئے، اپنے لئے ہو تو وہ تندرست نہ ہو جاتا...

بیمار ہونے کے لئے تندرست ہونا شرط ہے اگر آپ تندرست نہ ہوں گے تو پھر بیمار نہیں ہو سکتے۔

بیمار، بچے اور بوڑھے میں کوئی فرق نہیں ہوتا تینوں کی عادات ایک جیسی ہوتی ہیں، ضد کرنا۔ اپنی بات منوانا اور بات بے بات پر روٹھنا۔ اپنی بات منوانا اور بات بے بات پر روٹھنا۔ فرق صرف اتنا کہ بچے کی ایسی حرکات کو ایک چانٹے سے تبدیل کیا جا سکتا ہے مگر مریض اور بوڑھے کو صرف اللہ ہی سمجھاتا ہے اوپر لے جا کر۔

جس کی بیوی کبھی بیمار نہ ہوئی ہو وہ اسے ڈاکٹر کو ضرور دکھائے، بیوی کا بیمار نہ ہونا خاوند کی اچھی صحت کے لئے نقصان کا باعث ہو سکتا ہے۔

بیمار لوگ نہایت شریف اور بے ضرر ہوتے ہیں، وہ کسی کو کوئی نقصان نہیں دیتے اسی نیک فطرت کے موجب اللہ ان کی دعائیں قبول کرتا ہے وہ بھی کسی اور کے لئے ان کے لئے نہیں!

تاریخ گواہ ہے کہ دنیا میں جہاں بھی بدامنی پھیلی، جنگ ہوئی خون خرابہ قتل و غارت ہوئی، اس کے کارن ہمیشہ تندرست لوگ تھے آپ نے ہمیشہ تندرست لوگوں کو ہی لڑتے مارتے دیکھا ہوگا۔ کیا کبھی کسی بیمار مریض کو ایسی حرکات میں ملوث پایا گیا؟...

جی کبھی نہیں۔ ہمیشہ تندرست لوگوں نے ہی دنیا میں بگاڑ پیدا کیا۔ لہٰذا بیمار لوگ اسی نیکی کی وجہ سے اللہ کے نزدیک سمجھے جاتے ہیں۔ اور عام آدمی کی نسبت جلد اللہ سے جا ملتے ہیں۔

میں نے ایک دوست سے اس کی خوشگوار گھریلو زندگی کا راز پوچھا تو وہ بولا

"مجھے جب یہ کھٹکا ہوتا ہے کہ آج میری بیوی کا موڈ لڑنے کا ہے تو میں اسے کہہ دیتا ہوں جانی! کیا بات ہے آج تم کچھ بیمار بیمار سی لگ رہی ہو ٹھیک تو ہو نا؟ اور وہ ذرا دیر نہیں لگاتی اسی وقت سر باندھ کر لیٹ جاتی ہے"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک بیمار کا گھر میں

ہونا سکون کا باعث ہے اور خاص کر کے بیوی کا اسے کبھی کبھی ضرور بیمار ہونا چاہئے۔ اسی لئے ہم نے اس مضمون کے شروع میں کہا ہے کہ اگر آپ کی بیوی زیادہ بیمار نہیں ہوتی تو آپ اسے ڈاکٹر کو دکھانا مت بھولیے!

وقتاً فوقتاً بیمار ہونا دوسروں کو خدمت کا موقع فراہم کر کے ثواب دلوانا اور ملنے ملانے کا بھی ایک بہانہ ہے۔ کئی ایسے عزیز و اقارب بھی ہوتے ہیں جو ملنے کی چاہت رکھتے ہوئے بھی ملنے سے قاصر ہوتے ہیں مگر آپ کی بیماری انہیں یہ زرین موقع فراہم کرتی ہے اور تجدید محبت کا باعث بنتی ہے۔

بیمار رہنے سے گھر والوں کو کام کرنے کی عادت بھی پڑتی ہے۔ صحت مند بیوی کی موجودگی میں اکثر خاوند ہڈ حرام ہو جاتے ہیں اپنے لئے گلاس پانی کا بھی لینا پسند نہیں کرتے جبکہ بیوی کی بیماری کے دوران بچوں کی نیپیاں دھونے سے لے کر گھر کی صفائی تک کے کام خوش اسلوبی کے ساتھ نمٹا لیتے ہیں۔ گھر میں ایک فرد کی بیماری تمام گھر والوں کو مصروف رکھتی ہے اور مصروفیت اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے اس سے فقط صحت ہی نہیں اچھی رہتی دماغ بھی مصروف رہتا ہے جو ہزار آلائشوں سے بچائے رکھتا ہے۔

کہتے ہیں صحت مند جسم اور خالی دماغ شیطان کی آماجگاہ ہوتے ہیں ان سے جتنا پرہیز رکھ سکیں بہتر ہے۔

بیمار بندہ اللہ کے زیادہ نزدیک ہوتا ہے اسی لئے تو اس کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔۔۔ اور کون ایسا مسلمان ہے جو اللہ سے دور رہنے کے متعلق سوچ سکتا ہے۔۔۔

توبہ توبہ۔۔۔۔ یہ تو گناہ کی بات ہوئی نا!!۔۔۔۔۔۔۔

❀❀❀

دعا

نذیرؔ فتح پوری
08055755623

ریگِ صحرا پہ ابر برسا دے
جلتے بطنوں کی آبرو رکھ لے

کہکشاں، چاندنی، دھنک، تارے
تیرے ہی روپ کے ہیں آئینے

تو کہاں ہے؟ کہاں نہیں ہے تو
کون ان گتھیوں کو سلجھائے

آندھیاں بھی انہیں بجھا نہ سکیں
تیری مرضی سے جو چراغ جلے

تو ہرے موسموں کا خالق ہے
سوکھے پیڑوں کو زندگی دیدے

سانپ در آئے ہیں درختوں میں
پنچھیوں کو نئے بسیرے دے

برف زاروں کا ہے سفر در پیش
کوئی سورج مجھے عطا کر دے

تیری یادیں دلِ نذیرؔ میں ہیں!
اور ہونٹوں پہ تیرے ہی کلمے

❀❀❀

جوگندر پال کے لازوال افسانچے

(۱) موجود

کیا مجال، کوئی جان پہچان والا مر جائے اور وہ اس کے جنازے میں شامل نہ ہو۔ مگر آج ہم اسی کا جنازہ لئے قبرستان کی طرف جا رہے ہیں، اور کسی نے آگے پیچھے دیکھتے ہوئے مجھ سے حیرت سے پوچھا ہے۔

"تعجب ہے، آج وہ نہیں آیا!"

(مجموعہ "نہیں رحمٰن بابو" سے)

(۱)

"نہیں مجھے ان سیدھے سادے قیدیوں کی کوئی فکر نہیں۔ یہ بے چارے تو دو یا دس سال کھلے کھلے اپنے کیے کی سزا بھگت کر مکت ہو جائیں گے، قابلِ رحم تو وہ سیاہ بخت ہیں جو جنگ وِتا ریک نظریوں کی کال کوٹھڑی میں اپنے نہ کیے کی سزا جھیل رہے ہیں۔ آؤ بابو، ان سیاہ بختوں کے حق میں دعا مانگیں۔"

(۲)

"میں نے ایک عمر اندھے پن میں ہی کاٹ دی رحمٰن بابو، لیکن جب ایک برٹش آئی بنک سے حاصل کی ہوئی آنکھیں میرے ساکٹس میں فٹ کر دی گئیں تو مجھے دکھائی دینے لگا۔ اور میں سوچنے لگا، غیروں کا نقطۂ نظر اپنا لینے سے بھی اندھا پن دور ہو جاتا ہے"

❀❀❀

"ذکیہ مشہدی، ترنم ریاض سے زیادہ سینئر اور منفرد افسانہ نگار ہیں۔ عرصے تک ان کا فن ہماری تنقیدی بے اعتنائی کا شکار رہا۔ مگر گزشتہ برسوں میں ان کی اہمیت کو بجا طور پر محسوس کیا گیا ہے۔" ابوالکلام قاسمی 0571-2701504 "معاصر خواتین افسانہ نگار۔ مسائل و مشکلات" (سہ ماہی "فکر و فن" نئی دہلی اکتوبر تا دسمبر 2013)

سنو انجیل (Snow Angel)

ڈاکٹر ستیہ پال آنند
007034810957
satyapalanand786@gmail.com

رات کو کمرے کا سناٹا
جکڑ لیتا ہے اپنے آہنی ہاتھوں سے
اور پھر لا پٹختا ہے
اُسی بستر پہ
جس کی برف سی براق چادر کی
ہر سلوٹ میں لپٹی پڑی ہو
داہنی جانب کا ہلکا جھول
جس سے ایک مکمل جسم کا خاکہ اُبھرتا ہے
سنو انجیل کا شاید۔۔
اُس بدن کا
جو تُم اپنے ساتھ لے کر جا چکی ہو۔۔۔۔
اور میں ڈرتا ہوں
بائیں ہاتھ سوتا ہوں
تمہارا نقش بستر سے
سنو انجیل کا خاکہ
ہٹ گیا تو شب کے سناٹے میں کس سے
بات ہوگی؟

نوٹ:۔ یہ نظم جناب ستیہ پال آنند نے مورخہ ۱۸ دسمبر ۲۰۱۳ کو جناب جوگیندر پال کے دولت خانے میں عالمی انوار تخلیق کے لئے بغرض اشاعت دی تھی۔ ڈاکٹر ایم۔ اے۔ حق

❀❀❀

رتن سنگھ کے بے مثال افسانچے

(۱) دن رات کی مزدوری

میں ابھی پیدا ہی ہوا تھا۔

آنکھیں کھولیں تو روشنی میری آنکھوں میں جھنس گئی۔ آنکھیں چندھیا سی گئیں تو میں نے فوراً بند کر لیں۔

تھوڑی دیر بعد پھر آنکھیں کھولیں۔ پھر وہی بات ہو گئی۔ اس بار روشنی زیادہ تیز تھی۔

میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ساتھ ہی ٹانگیں مار مار کر روشنی کو پیچھے ہٹانے کی کوشش کرتا رہا۔

اس طرح دن بھر روشنی کا بوجھ ڈھوتا رہا۔

دن کسی نہ کسی طرح ختم ہوا تب کہیں جا کر روشنی کا گٹھر سر سے اُتر پایا۔

تبھی رات آ گئی۔

رات نے آتے ہی اپنا اندھیرے کا گٹھر دھیرے سے میرے آگے سر پر رکھ دیا۔

اِس بوجھ کی بات تو خیر چھوڑیئے۔

اندھیرے نے آنکھوں کے آگے پردہ سا کر دیا، وہ الگ۔

کچھ بھی دکھائی نہ دے۔ یہاں تک کہ ماں کا دودھ بھی نظروں سے اوجھل۔ کسی طرح ٹٹول ٹٹال کر کام چلایا۔

اب یہ روز کا معمول ہے۔

ادھر سورج کی ٹکیا آسمان پر آتی ہے اور دن روشنی کا گٹھر میرے سر پر رکھ دیتا ہے۔ دن کا پہرا ختم ہوتے ہی یہ بوجھ اُترتا ہے تو رات اندھیرے کا گٹھر میرے سر پر رکھ دیتی ہے۔

رات دن کی یہ مزدوری کرتے میری عمر بیت رہی ہے۔

❀❀❀

کہانیوں کی کہانی

ایک دن میں نے دیکھا کہ اس کتاب کی ساری کہانیاں زندہ و جاوید ہو کر مایوسی میں سر جھکائے بیٹھی تھیں۔

"کیا ہوا ہے آپ کو" میں نے پوچھا، "آپ کے چہرے کیوں اُترے ہوئے ہیں؟"

"کلا کے پارکھی ہمیں "منی کہانی" یا "افسانچے" کہہ کر بلاتے ہیں۔ آپ نے ہمیں اتنا چھوٹا کیوں رکھا؟" اُن میں سے ایک نے پوچھا۔

کوئی بھی کلا کرتی یا فنی تخلیق اپنے قد یا کتاب کے اعتبار سے کہوں تو صفحات کی بنا پر چھوٹی یا بڑی نہیں بنتی۔ وہ اچھی بنتی ہے اپنے خوبصورت نین و نقش سے، اس میں چھپے ہوئے دانشمندانہ یقین سے، یہ یقین اُن کی نین و نقش میں ایسی کشش بھر دیتے ہیں کہ دُنیا دیکھ دیکھ کر عش عش کرتی ہے۔۔"

"تیری بسرے کی کمائی کی کمر توڑ دونگی
پیدا کر کے نو لڑکیاں۔"

لو پنجاب کی ایک اور لوک بولی یاد آ رہی ہے۔

"تیری چار پیسوں کی نوکری
میرا لاکھوں کا جوبن جائے۔"

میں سمجھتا ہوں کہ ان دو بولیوں میں پوری کہانیاں بیان ہوئی ہیں اور ان دو سطروں میں ان کے گہرے معنی چمکتے دمکتے سامنے آ جاتے ہیں"

اپنے آپ میں مکمل ہونے کی وجہ سے یہ بولیاں لوگوں کے دلوں میں دھڑکتی ہیں"

کہانیوں پر اپنی بات کا اثر ہوتے دیکھ کر میں نے بات کو ختم کرتے ہوئے کہا: "کچھ ماسوں یا ایک تولے کا چھوٹا سا ہیرا، منوں بھاری پتھر کی نسبت زیادہ خوبصورت اور قیمتی ہوتا ہے۔"

میری بات سُن کر کہانیاں "چوں" "چوں" کرتی ہوئی چہک اُٹھیں۔

❀❀❀

"کسے خبر تھی کہ سورج کا قتل کردے گا [illegible] وہ جس نے بچوں کو جگنو بھی نہ مارنے دیا"
اظہر عنایتی 094125 41108 (سہ ماہی "اسبتسار" جے پور مارچ 2014)

ایک ہے عیشاں

ایک لڑکی تھی عیشاں۔ میری بچپن کی ہم جولی۔ مجھے بڑی اچھی لگتی تھی۔

ایک دن اُس کے ساتھ بارہ ٹہنی کھیلتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ آج تو دادی نے میٹھے چاول بنائے ہیں۔

میں نے عیشاں سے کہا، ''آ میرے ساتھ گھر چل۔ تجھے میٹھے چاول کھلاؤں گا۔''

''اُونہوں! مجھے نہیں اچھے لگتے میٹھے چاول'' عیشاں نے کہا۔

''تجھے کیا اچھا لگتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بتادوں؟''

''ہاں بتاؤ''

''بتادوں؟''

''ہاں بتاؤنا''

اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور کہا،

''مجھے تم اچھے لگتے ہو'' یہ کہتے ہوئے اُس نے ہاتھ مار کر ٹہنیاں بکھیریں، اُٹھی اور اپنے گھر کی طرف بھاگ گئی۔

میں اُسے آواز دیتا ہی رہ گیا، ''عیشاں عیشاں''

لیکن عیشاں کہاں سنتی تھی۔ وہ گھر کا موڑ مُڑ گئی۔

وقت گذر گیا۔ جوانی بیتی۔ بڑھاپا آ گیا۔

ایک دن میری بیوی نے میٹھے چاول بنا کر پلیٹ میری طرف بڑھائی تو پتہ نہیں کیسے مجھے عیشاں والی بات یاد آ گئی۔

ہاتھ میں چاول کی پلیٹ پکڑے، بچپن کی یادوں میں ڈوبے میرے مُنہ سے نکلا، ''رُک ذرا رُک''

میرے بول سُن کر رسوئی کی طرف جاتی میری بیوی رُک گئی اور پوچھا، ''کیا بات ہے؟ کچھ اور چاہیے؟''

''میں نے تو آپ کو کچھ نہیں کہا''

''رُکنے کے لئے کہا تو ہے آپ نے۔''

میں نے بیوی کو ساری بات بتائی۔ بڑا ہنسی وہ۔

اب جب بھی میٹھے چاول بنانے کے لئے کہتا ہوں تو بیوی کا جواب ہوتا ہے، ''کیا فائدہ؟ آپ کی وہ عیشاں کو تو اچھے نہیں لگتے۔''

اور پھر عیشاں کے بول، ''مجھے تو تُو اچھا لگتا ہے۔'' کانوں میں گونجتے ہیں تو میرا بڑھاپا اُسی وقت بچپن کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔

❀❀❀

ایک ضروری اعلان

آج خطوط نویسی کا رواج روز بہ روز کم ہوتا جارہا ہے جبکہ رسائل میں خطوط کے ذریعہ تصنیفات کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا پتہ چلتا ہے۔ شعراء و ادباء کے لئے قارئین کے خطوط حوصلہ افزا یا مشعلِ راہ ثابت ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی اس سے ایک صحت مند بحث کا آغاز بھی ہو سکتا ہے۔ مراسلہ نگاروں سے گذارش ہے کہ وہ اپنا پورا پتہ اور موبائل نمبر ضرور دیں۔ ہم شائع شدہ خطوط میں سے قرعہ اندازی سے نکلنے والے ایک شخص کی رنگین تصویر مع شخصی کوائف اگلے شمارے میں شائع کریں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔(ادارہ)

❀❀❀

تمہاری قبر پر

ندا فاضلی
09869487139

تمہاری قبر پر میں
فاتحہ پڑھنے نہیں آیا
مجھے معلوم تھا تم مر نہیں سکتے
تمہاری موت کی سچی خبر جس نے اُڑائی تھی
وہ جھوٹا تھا
وہ تم کب تھے
کوئی سوکھا ہوا پتا
ہوا میں گر کر ٹوٹا تھا
میری آنکھیں
تمہارے منظروں میں قید ہیں اب تک
میں جو بھی دیکھتا ہوں
سوچتا ہوں
وہ وہی ہے
جو تمہاری نیک نامی اور بدنامی کی دُنیا تھی
کہیں کچھ بھی نہیں بدلا
تمہارے ہاتھ میری انگلیوں میں سانس لیتے ہیں
میں لکھنے کے لئے جب بھی قلم کاغذ اٹھاتا ہوں
تمہیں بیٹھا ہوا میں
اپنی ہی کرسی میں پاتا ہوں
بدن میں میرے
جتنا بھی لہو ہے
وہ تمہاری لغزشوں، ناکامیوں کے ساتھ بہتا ہے
میری آواز میں رہ کر
تمہارا ذہن رہتا ہے
مری بیماریوں میں تم
مری لاچاریوں میں تم
تمہاری قبر پر جس نے تمہارا نام لکھا ہے
وہ جھوٹا ہے
تمہاری قبر میں
میں دفن ہوں
تم زندہ ہو
ملے فرصت کبھی
تو فاتحہ پڑھنے چلے آنا

❀❀❀

''اس وقت یہ عورت اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی اپنی ساڑی کا پھٹا ہوا بارڈر اس طرح سی رہی ہے جیسے زندگی کی شام تک پہنچ کر عمر بھر لگائے زخموں کو سینے کی کوشش کر رہی ہو'' رتن سنگھ 09911146994 ''دوسرا طلاق'' (ماہنامہ ''آجکل'' اپریل 2014)

ہندوستانی ادب میں مشترکہ تہذیب کے رُجحانات

پروفیسر صغیر افراہیم
09358257696

روزِ اول سے یہ ملک امن و انسانیت کا گہوارہ اور ظلمتوں کی فضاؤں میں دمکتا ہوا ماہتاب رہا ہے۔ موہن جوداڑو اور ہڑپا، اجنتا اور ایلورا کے نشانات، قطب و تاج کے اونچے مینار اس کی عظمتوں کے گواہ ہیں۔ اس ملک میں مختلف مذہب کے لوگ آباد ہیں تاہم ان سب کی قومی حیثیت ایک ہے۔ جس طرح چمن میں کھلنے والے رنگا رنگ پھول اپنی انفرادیت کے باوجود گلدستے میں مجموعی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اسی طرح جدا جدا شکل و صورت اور زبان و عقائد کے لوگ قومی اعتبار سے ایک ہی صف میں شامل ہو کر محمود و ایاز کی تمیز ختم کر دیتے ہیں۔ ان کے عقائد، رسم و رواج ایک دوسرے سے متاثر ہیں۔ یہ قدرِ مشترک اس مردم خیز خطے کی دین ہے جس میں زمانۂ قدیم سے ایسی برگزیدہ اور معجز نما شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں جنھوں نے علم و حکمت، شعر و ادب اور رشد و ہدایت کے ساتھ ساتھ اصلاحِ ملک و ملت اور قوم و وطن کی بے لوث اور قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں اور سب مذہبوں کی توقیر و تعظیم کی ہے۔ قومی اتحاد، پیار و محبت، امن اور رواداری کی جیتی جاگتی مثال ہے "اردو"۔ آیئے سب سے پہلے اس زبان کے تعلق سے گفتگو کر لیں۔

اردو آریائی زبان ہے اس کا تاریخی سلسلہ آریوں کے داخلۂ ہند سے شروع ہوتا ہے۔ تقریباً چار ہزار سال قبل آریائی لوگ کچھ ضرورتوں کے تحت شمالی ہند میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوئے اور ملک کے مختلف حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ان کی آمد کا سلسلہ عرصے تک چلتا رہا۔ رفتہ رفتہ وہ مقامی باشندوں سے گھل مل گئے۔ اسی میل ملاپ سے ایک نئی زبان وجود میں آئی جس کو ہند آریائی زبان کہا گیا ہے۔ گریرسن کے مطابق ہندوستان میں آریوں کے دو بڑے گروہ آئے جو آہستہ آہستہ پورے ملک پر چھا گئے۔ آریائی زبان سے پہلے یہاں دراوڑی زبان کا بول بالا تھا لیکن مذکورہ انقلاب کے بعد اس کی جگہ آریائی بولیوں نے لے لی۔ یہیں سے ویدک تہذیب وجود میں آئی جس کا اظہار سنسکرت زبان میں ہوا۔ سنسکرت سے پراکرتوں نے جنم لیا، اور پراکرتوں سے اپ بھرنشیں وجود میں آئیں، پھر شورسینی اپ بھرنش کے دھندلکے سے اردو کی شعاعیں پھوٹیں۔

ماہرینِ لسانیات اس پر متفق ہیں کہ آریوں کے بعد یونانی، تاتاری، عرب اور افغان اس ملک میں آئے۔ آنے والے قافلوں کے ساتھ ان کی زبانوں کے الفاظ بھی مقامی بولیوں میں شامل ہوتے چلے گئے۔ اس آمد و رفت اور میل ملاپ سے ایک ایسی زبان پورے برِ صغیر میں بنتی چلی گئی جو آپسی لین دین اور سمجھنے سمجھانے کا ذریعہ بنی۔ ابتدا میں یہ زبان بول چال کی تھی بعد میں اس نے فارسی رسم الخط اختیار کر لیا۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مشترک اظہار و ابلاغ کے سبب جو زبان وجود میں آئی اس کا بیج برِ صغیر ہند و پاک میں صدیوں سے تیار ہو رہا تھا۔ اسی لئے کھڑی بولی کے ڈھانچے پر مشتمل یہ محض ایک زبان ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب، طرزِ فکر، طرزِ تمدن کہلائی۔ اس کے خمیر و خمیر میں شروع سے ہی میل و محبت اور بھائی چارے کا عنصر شامل رہا ہے جس کی بدولت اس کے اثرات تیزی کے ساتھ بازاروں، فوجی چھاؤنیوں، میلوں ٹھیلوں، تجارتی رہگزاروں اور بندرگاہوں میں پھیلتے چلے گئے۔ یہ زبان فوجی لشکروں، تاجروں اور صوفی سنتوں کے ساتھ ہندوستان کے جن جن گوشوں میں جاتی وہاں ایک باوقار بولی کی حیثیت اختیار کر لیتی اور پھر اس دیارِ یار کے جاذبِ نظر اثرات کو ساتھ لیتی ہوئی آگے بڑھ جاتی اور اپنے پیچھے ایسے نقوش چھوڑ جاتی جن کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ محقق کی حیثیت سے مولوی عبدالحق، دانشور کی حیثیت سے عنبر بہرائچی اور ادیب کی حیثیت سے جاوید وششٹ نے بھی اس سلسلے میں صوفی سنتوں کی خدمات کا مدلل اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر جاوید وششٹ "دکھنی درپن" میں لکھتے ہیں:

> "صوفیاءِ کرام فطرتِ انسانی کے اسرار و رموز کے محرم، نفسیاتِ انسانی کے پیچ و خم سے آگاہ، مابعد الطبیعات کے نشیب و فراز سے باخبر اور عوام کے مزاج داں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں بھی گئے وہاں کے ماحول میں ڈھل گئے اور وہاں کی بولی بولنے لگے۔

عوامی بولی میں ہی انھوں نے اپنا پیغامِ محبت عوام تک پہنچایا۔ عوام سے قربت کے لیے یہ ناگزیر بھی تھا اور پھر ان کا بنیادی مقصد تبلیغ مذہب تھا۔"

جاوید صاحب کی اس بات سے کہ صوفیوں کا "بنیادی مقصد تبلیغ مذہب تھا" اتفاق نہیں کیا جاسکتا ہے۔ صوفیائے اکرام نے مذہب کی تبلیغ نہیں بلکہ انسانیت کا درس دیا ہے۔ خلوص، محبت، مفاہمت اور رواداری کا عملی ثبوت دیتے ہوئے حق و صداقت کی جانب ابن آدم کو راغب کیا ہے ان کے اس تبلیغی عمل سے لوگ متاثر ہوئے اور ان کے رنگ میں رنگتے چلے گئے۔ اسی کے زیر اثر عرفان، اخلاق اور انسان دوستی کی طرز پر اردو زبان کی بھی پرورش ہوئی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی تحقیق کے مطابق تہذیبی اور تمدنی لین دین کے سلسلے میں عرب و ہند کے تعلقات بہت مضبوط تھے۔ ظہورِ اسلام کے بعد اس کا سلسلہ اس وقت اور بھی وسیع ہوتا ہے جب محمد بن قاسم سندھ میں داخل ہوتا ہے۔ مولانا سید عبدالحیٰ اس جانب واضح اشارہ کرتے ہیں کہ اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں بہت جلد اپنی جگہ بناتے چلے گئے شاید اس وجہ سے بھی کہ "منو اسمرتی" کے قوانین میں طبقے کو اہمیت ملی تھی اور اسی کے مطابق قدیم ہندوستانی نظام کا تصور طبقوں میں تقسیم ہوا تھا۔ اس پر تفصیلی گفتگو تاراچند نے کی ہے کہ طبقاتی نظام کی جو بنیاد ویدوں میں پڑی تھی "منو اسمرتی" کے ساتھ اس کی تکمیل ہوئی، اور اسلامی تصورِ حیات نے انسانی درجہ بندی کے اسی قدیم تصور پر ضرب لگائی تھی۔ عرب و ہند کے تجارتی تعلقات رہی حدود کو پار کرتے ہوئے روحانی سکون کا سبب بھی بنتے ہیں۔ منصور حلاج اور ابن عربی کے توسط سے وحدت الوجودی تصور قادریہ، چشتیہ اور کسی حد تک سہروردیہ سلسلے کے صوفیاء کے ذریعے فروغ پاتا ہے۔ نقش بندی سلسلے نے اس رجحان کی تائید نہیں کی مگر انھوں نے بھی روحانی تربیت کی بات کرتے ہوئے انسانی معاشرے میں ایکتا، محبت اور پیار کے نغمے بکھیرے ہیں بلکہ تمام صوفیاء کرام کا اولین مقصد یہی رہا ہے کہ خلق خدا کو اپنا بھائی سمجھا جائے اور ان سے بلا تفریق مذہب و ملت محبت کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بھگتی تحریک اور سکھ مت پر مسلم صوفیاء کے واضح اثرات نظر آتے ہیں کہ ان کا بھی نصب العین انسانیت اور امن رہا ہے۔ وحدت الوجود کا تصور، ہمہ اوست کے نظریہ میں مدغم ہو کر مہاتما بدھ اور مہاتما جین کی دھرتی کو سر سبز و شاداب کرتا ہے۔

زبان و ادب کی تاریخ یہ ظاہر کرتی ہے کہ ہندوستان میں آریوں کی آمد سے عقائد، افکار، خیالات، نظریات، رسم و رواج میں ٹکراؤ آیا ہے۔ یہ ٹکراؤ آریاؤں اور دراوڑوں کا ہو یا بودھ، جین، برہمن کا یا پھر ہندو، مسلمان کا --- لیکن اسی ٹکراؤ نے مفاہمت اور یگانگت کی راہ بھی نکالی ہے۔ انسانی محبت، رواداری، بھائی چارے کو فروغ اور ملی جلی تہذیب کو تقویت دی ہے۔

جب جب قومیں غرور، تعصب، تنگ نظری اور تفریق کا شکار ہوئی ہیں تب تب مفکر، مصلح، رہبر کی ضرورت پیش آئی ہے۔ ماضی بعید میں خسرو، کبیر، نانک اور خواجہ معین الدین چشتی اس کی اہم مثالیں ہیں جنھوں نے نہایت مستحکم انداز میں نہ صرف مذکورہ بالا نکات پر سوالات اُٹھائے ہیں بلکہ انوکھے دلائل بھی پیش کیے ہیں۔ مثلاً امیر خسرو کے عہد سے ہند ایرانی تہذیب کو فروغ ملا ہے چونکہ اُن کے نظریہ حیات و کائنات میں قرآن و حدیث کی تعلیمات کے ساتھ بھگوت گیتا، رامائن اور مقامی صوفی سنتوں کے اثرات بھی شامل تھے۔ لہٰذا اس مشترکہ مطمح نگاہ کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ دانشورانِ ادب کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف نے برج بھاشا کے علاقہ میں آنکھ کھولی اس لیے کرشن بھگتی سے واقف تھے۔ دو سال اودھ میں گزارے اس لیے رام بھگتی سے بھی ناواقف نہیں تھے۔ ۱۲۸۵ء میں وہ منگول حملے سے اپنے ملک کو بچانے کے لیے پنجاب (لاہور) میں سلطان محمود کے ساتھ تھے۔ سلطان شہید ہوا، خسرو دریائے راوی کے کنارے گرفتار ہوئے۔ کافی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد رہائی نصیب ہوئی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چنگیز خاں کی تباہیوں اور بربادیوں کے اثرات نے ان کو حقائق و معارف کی طرف ملتفت کیا، حیات انسانی کی اہمیت کا احساس دلایا۔ نتیجتاً فارسی اور مغربی ہند کی بھاشا کھڑی بولی کی آمیزش سے ایک نئی زبان اور نئے تمدنی ذوق کو تقویت حاصل ہوئی۔ ملی جلی زبان میں شاعری کی بنیاد رکھی اور موسیقی کی ایک نئی لَے، ہند ایرانی سے پیدا کی۔ انھوں نے نہایت فراخ دلی سے امرا و سلاطین کے دربار میں ہندوستانیوں کی ذہانت، علمی استعداد، محبت، مروت اور شرافت کی تعریف کی۔ ان کو ہندوستان کے محلوں، میناروں، مرغزاروں، سبزہ زاروں سے جو انس، شیفتگی اور وارفتگی رہی ہے اُس کو ضیاء الدین برنی سے لے کر پروفیسر وحید مرزا تک نے مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے۔ وہ مقامی باشندوں کے اوصاف خصوصاً وفاداری، وحدانیت اور علوم و فنون سے بے پناہ رغبت کو اُجاگر کرتے ہیں اور سنسکرت زبان کے ادبی و شعری کمالات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

امیر خسرو کی بیشتر تخلیقات کو اردو کے قالب میں ڈھالا جاچکا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی

"ترقی پسند ادیبوں و فنکاروں میں خواجہ احمد عباس ایسے منفرد و مختلف تخلیق کار ہیں جن کو شہرت تو ملی، لیکن ادب و تنقید میں وہ مقام اور حیثیت نہیں دی گئی۔" پروفیسر علی احمد فاطمی 09415306239 مضمون "خواجہ احمد عباس کے دو تنقیدے" (ماہنامہ "آجکل" جون 2014)

فارسی اور ہندوی شاعری میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور معاشرے کے مختلف پہلوؤں کو پہلی بار فنکارانہ طور پر پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے مشترکہ زبان اور شعر و ادب کی تحقیق کرتے ہوئے گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دیا۔ اور ہندوستان کی فضا، آب و ہوا، چرند و پرند، حیوانات و نباتات، شہر، قصبات، موسموں سے وابستہ تیوہار، رقص و موسیقی کا ذکر نہایت والہانہ جوش سے کیا ہے اور بہت سے ایسے الفاظ کو ادب کا جامہ پہنایا ہے جو ان کے کلام میں رچ بس کر ایک نئی زبان کا حصہ بن گئے ہیں مثلاً چراغ، دیا، آئینہ، کاجل، دانت کی مسی، کنگھا، ہار، انگیا، دھوپ، قینچی، بئے کا گھونسلہ، نیم کی نبولی، آرسی، موری، ناؤ، چوکی وغیرہ۔ اسی طرح انھیں پھلوں میں انگور، سنترہ، کیلا، آم، خربوزہ حتیٰ کہ پان بھی بے حد پسند تھے۔ پھولوں میں مولسری، چمپا، جوہی، کیوڑا، سوسن، بیلا، لالہ، ڈھاک، سیوتی اور گیندا وغیرہ۔ خوشبوجات میں صندل، عود، لوبان، عنبر، کافور اور چرند و پرند میں طوطا، مینا، کوا، مور، بگلا، ہاتھی، بندر کا ذکر انھوں نے اپنے ادب میں بار بار کیا ہے۔

وطن کی محبت کو انھوں نے مختلف زاویوں سے شعری قالب میں ڈھالا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ جس کو جتنی اپنے ملک سے محبت ہوگی وہ اتنا ہی سچا اور پکا وطن دوست ہوگا۔ انھوں نے موقع موقع پر سلاطین و امرا کو مشورہ دیا ہے کہ حکومت کی بنیاد بلا تفریق مذہب و ملت، محبت و ہمدردی، انصاف و ایمانداری پر ہو، اور اگر تم طاقت ور بننا چاہتے ہو تو تمھیں اپنی رعایا کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ وہ نفس کو سب سے بڑا دشمن مانتے ہوئے نفس امارہ کو ختم کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم چاہے جتنا سر اٹھا کر چلیں، فخر و غرور سے اترائیں مگر ایک دن خاک میں مل جانا اور پیروں کی دھول بن جانا ہے تو پھر کیوں نہ ہم زندگی ہی میں خاکسار بن کر رہیں۔

خاکساری کے اس درس کے لیے انھوں نے سلاطین اور صوفیاء کرام کے ارشادات کو مذہب کی کسوٹی پر پرکھا، اور اس کی اصل روح کو ابھارتے ہوئے جزوی اختلافات کو ختم کرنے کے جتن کیے۔ اتحاد اور انسانیت کے اعلیٰ تصور کو پیش کیا۔ مقامی زبان، بولی، لب و لہجہ، لباس، وضع قطع کو اختیار کرتے ہوئے امیر خسرو ہندوستانی فضا میں گھل مل گئے۔ ان کے اس مثبت پہلو کے شاندار نتائج تقریباً سو سال بعد سنت کبیر کی شکل میں نمودار ہوئے۔ اس طرح ہمارے ملک میں ایک نئی تہذیب کی بنیاد پڑی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کہتے ہیں۔

سنت کبیر ایک منفرد انقلابی کی شکل میں ہندوستانی معاشرے میں نمودار ہوئے۔ اُن کا مذہب عوام سے عشق اور انسانیت کا درس رہا ہے۔ وہ ذات پات، ادنیٰ و اعلیٰ کی تخصیص کے خلاف تھے۔ اپنے عہد میں رائج حکایتوں، روایتوں اور اُپدیشوں کی روح کو سمجھتے ہوئے علم و عمل، بھکتی اور محبت کے عناصر کو جمع کر کے شعری پیرہن عطا کیا ہے اور معاشرے میں ایک نئی فکر کے موجد قرار پائے ہیں۔

صوفی منش کبیر کی شخصیت کی اٹھان میں معاشرتی پس منظر اور اُن کی نجی زندگی کے تضاد کا اہم رول رہا ہے۔ مختلف اور متضاد افکار اور فلسفیانہ خیالات نے انھیں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی زندہ مثال بنا دیا تھا۔ انھوں نے جہاں اپنے عہد کی اندھی عقیدت مندی، توہم پرستی، رسم و رواج، ذات پات وغیرہ پر سخت تنقید کی ہے وہیں اپنے اکھڑ مزاج اور اظہار کی سادگی سے انسانی بھائی چارے کی ایک نئی راہ بھی دریافت کی ہے جس پر چلنے کی آج ہم ہندوستانیوں کو بے حد ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور شائد اب یہی راہ امن و آشتی کی ہے۔ چھ سو سال گزر جانے کے بعد بھی کبیر کی شخصیت ایک انقلابی مفکر، ایک بڑے مصلح قوم اور انوکھی صلاحیت کے مالک کی ہے جنھوں نے مذہب کے ٹھیکیداروں کو پھٹکار لگائی، محبت کی تبلیغ کی اور انسانیت کو ایک نئی جہت بخشی، انھوں نے بظاہر ایک شاعر، سنت یا فقیر کی شکل میں اپنے پُر آشوب عہد کے سامنے مضبوطی سے کھڑے ہو کر مذہب، معاشرے اور ادب کے میدان میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔

کھڑی بولی، ہندوی، ریختہ وغیرہ کے نام سے پہچانی جانے والی یہ لشکری زبان ملک کے مختلف علاقوں میں عسکری قوت بن کر نہیں بلکہ صوفی سنتوں کے سایہ تلے پھلتی پھولتی رہی۔ عربی کا جلال، فارسی کا جمال اور سنسکرت کی چھا جانے اور گھر کر لینے والی کیفیت اس کے رگ و ریشے میں پیوست ہے۔ اس آویزش اور آمیزش کی بنا پر ہی یہ روز اول سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی امین رہی ہے۔ مشترکہ تہذیب اور محبت و اخوت کی علامت کے طور پر ابھرنے والی یہ زبان ہمیشہ سے ذات پات، فرقہ و عقیدہ، دیر و حرم کی تخصیص و تمیز سے مبرا نظر آتی ہے۔ اس کا ادبی روپ نہ جانے کیوں سب کو کچھ ایسا بھایا کہ لاکھ مخالفتوں کے باوجود پھل پھول رہا ہے۔ ماضی بعید میں یہ ادبی زبان اس علاقے میں پروان چڑھی ہے جس کا مرکز دہلی اور دہلی کا قرب و جوار تھا۔ مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے عہد کا غیر مسلم پرستار چندر بھان برہمن جو دارا شکوہ کا منشی اور فارسی کا پہلا صاحب دیوان ہندو شاعر تھا، وہ ایک موقعے پر یہ اشعار قلم بند کرتا ہے۔

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالہ ہے
پیا کے ناؤں کی سمرن کیا چاہوں کروں کس سیں
نہ تسبی ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے

"جو بھی ملا یہاں یہی کہتا ہوا ملا ❖ اپنی بھی آستین میں کچھ سانپ پل گئے"
شمسی قریشی 09565059506 (ایوان اردو فروری 2014)

سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب اس سیکولر زبان نے ہر دور بلکہ ہر مشکل گھڑی میں محبت و مساوات کی بات کی، سب کو ساتھ لے کر چلی ہے، سب کو عزیز رہی ہے تو پھر بدیسی کا طعنہ کیوں؟ مسلمانوں تک کیوں محدود کرنے کی چال چلی جا رہی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب "بدیسیوں" کو اس کا علم ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ملک کی آزادی کی خاطر بہادر شاہ ظفر کو بادشاہ تسلیم کر لیا ہے تو انھیں اپنی پالیسی (پھوٹ ڈالو راج کرو) متزلزل ہوتی نظر آئی اور انھوں نے ایک حربہ یہ بھی استعمال کیا کہ "اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے"۔ پچھلے سو سال سے وہ اس کا اعلان تو نہیں کر سکے تھے مگر یہ زہریلا بیج ۱۸۵۷ء میں ہی انھوں نے بو دیا تھا۔ انگریزوں کی شاطرانہ چال کو میر جعفر جیسے لوگ تو نہیں سمجھ سکے تھے مگر رام نارائن موزوں (وفات ۱۷۷۳ء) اسی وقت سمجھ گیا تھا جب اسے نواب سراج الدولہ کی شہادت کی خبر ملی اور اس نے فی البدیہہ یہ شعر کہا۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

نواب سراج الدولہ کی شکست کے بعد ٹیپو سلطان کی شہادت اور پھر فورٹ ولیم کالج کا قیام سوچا سمجھا منصوبہ تھا جس کو تقویت میر جعفر اور میر صادق جیسے لوگ پہنچا رہے تھے۔ ممتاز تاریخ داں بی این پانڈے "ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات" میں اس موضوع پر مدلل روشنی ڈالتے ہوئے واضح کرتے ہیں کہ "بدیسیوں" نے کس طرح:

"اردو کو مسلمانی زبان بنا دیا
اور ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کو
مسلمانوں کے سر تھوپا۔
مسلمانوں کو نیچا دکھانے کی
کارروائیاں جاری ہوئیں۔
بہار کے انگریز گورنر نے
شہروں کا دورہ کیا اور اردو
کے خلاف دھواں دھار لیکچر
دیے۔"

ہر صوبے میں جذبات بھڑکانے کا جتن کیا گیا۔ ۱۸۹۲ء میں اتر پردیش کے گورنر میکڈونل نے تو ہندی اردو کے تعلق سے فساد برپا کرا دیا، اور اس غلط خیال کو تشہیر و استحکام دیا کہ اردو مسلمانوں کی اور ہندی ہندوؤں کی زبان ہے۔

سید عابد حسین، بشمبر ناتھ پانڈے اور عرفان حبیب نے تہذیب و تمدن کے مفہوم پر مدلل اور تفصیلی گفتگو کی اور اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ان دانشوروں نے مشترکہ تہذیب سے متعلق خاصا مواد مہیا کیا ہے۔ مغل شہنشاہ اکبر نے "دینِ الٰہی" کے ذریعہ جو تصور اجاگر کیا اس کو عبدالقدوس رسا یہ جامہ عطا کرتا ہے۔

کبھی نہ مسجد و مندر میں امتیاز کروں
بتوں کی کر کے پرستش ادا نماز کروں

اور میر تقی میر اس کو یوں بیان کرتے ہیں ۔

میر کے دین و مذہب کو پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

ہندوستانی ادبیات میں کتھائیں، داستانیں، نوٹنکیاں، بھرت ملاپ اور میلے ٹھیلوں کی رونقوں کے ساتھ جہاں ایک طرف نجومی، جوگی، سنیاسی، ناصح، پنڈت پروہت ہیں وہیں شری رام چندر، شری کرشن، مہاتما بدھ، حضرت عیسیٰ، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، امام حسین کا ذکر ہے۔ گرونانک، خواجہ معین الدین چشتی، حضرت نظام الدین وغیرہ کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ مقدس کتابوں، تیرتھ استھانوں، دعاؤں اور منتروں کے جاپ کے ساتھ شب مالوہ، شام اودھ اور صبح بنارس کا بھی تذکرہ ہے۔ طرح طرح کے مشترکہ لباس اور زیورات کے ساتھ رسومات میں مونڈن، تیجا، چہلم وغیرہ سے وابستہ تفصیلات ہیں۔ ہاتھی گھوڑا پالکی رتھ ہے۔ تقریبات میں خوشی اور غم دونوں کے الگ الگ سایے ہیں۔ شادی بیاہ میں سنجوگ بندھنا، لگن وغیرہ ہے۔ گھوڑی چڑھنا۔ منھ دکھائی، تھال کھیلنا، جوتا چرانا، سمدھنوں کا آنا، رنگ رلیوں اور بدھاوے کا ذکر ہے۔ تیوہاروں میں دیوالی، ہولی، دسہرہ، کنھیا جی کا جنم، بلدیو جی کا میلہ، محرم، شب برآت، گنگا اشنان، جشن نو روز، ماتا نیلہ، رکچھا بندھن اپنی اپنی بہاریں دکھلاتے ہیں۔ موسمی کیفیات میں جاڑا، گرمی، برسات، ساون، بھادو، بسنت، اماوس، خزاں، بہار سب کچھ اسی خطۂ ارض کے تعلق سے ہیں اور جنھیں سب مل کر مناتے ہیں۔

ہماری یہ مشترکہ تہذیب جسے محمد قلی نے "قطب مندر" کے ذریعے پروان چڑھایا وہ دکنی شاعری کے ہندی روپ کو چار چاند لگاتا ہے۔ یہ قطب شاہی بادشاہ ہندو مسلم تیوہاروں کو شاہی پیمانے پر مناتا تھا۔ وقت کے لاکھ تیز و تند تھپیڑوں کے باوجود ہمارے عہد میں اب بھی اس موضوع پر بہت لکھا جا رہا ہے۔ پانچ شعری مجموعوں کی "ادھوری حکایت" کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قوموں کے میل جول سے مکمل ہوئی۔ انیس انصاری نے بابا فرید گنج، نظام الدین، وارث علی کے ساتھ کئی لائق صد احترام شخصیتوں کے توسط سے ملی جلی تہذیب کے قوس و قزح کو ظاہر کیا ہے۔ ان کے یہاں سبز پری، کالا دیو، راج کنور، رانجھا اور میرا کے کردار بھی اسی کا الاپ

"دورِ جاہلیت میں لڑکی کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ آج بڑے مہذب انداز میں اُسے پیدا ہی نہیں ہونے دیا جا رہا ہے،
جس کی طرف ڈاکٹر حنیف شباب نے اپنی ایک نظم "اور لائن کٹ گئی" میں توجہ دلائی ہے۔" رؤف خیر 09440945645 مضمون
"تعمیری ادب کی تخلیق۔ مسائل۔ وسائل۔ امکانات" (ماہنامہ "پیش رفت" نئی دلی اپریل 2014)

کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مرگ ترشنا، امرت، سدرشن، مہا دیو، ابھی منیو، سیتا اور راون اشاروں اشاروں میں قول و فعل کی پوری روداد بیان کر دیتے ہیں۔ یکجہتی، پنچھی، رجنی گندھا، دھنک، شدھی، شریمان، چکر، دیو، وشنو، موتی، اہل تاس، اکثر، جل ترنگ، کنچن، کول، روپ، بھوانی، گیانی، رام کہانی، بن باس، جیون، نروان، چتا، آتما، اگنی دیو، دھرتی، آکاش، پاتال انیس انصاری کے کلام میں گھل مل کر ایک نئی آواز بن گئے ہیں۔ یہ تیور عنبر بہرائچی کے یہاں بھی نظر آتے ہیں۔ حالانکہ دونوں کی اپنی فکر، اپنا لہجہ ہے۔ دونوں نے نئے استعاروں اور تشبیہوں کے ذریعے شاعری کے جو نمونے پیش کیے ہیں وہ مفہوم و معنی کے نئے باب وا کرتے ہیں۔ تاریخ و تہذیب کے علاوہ شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کی گلیوں کے ایک ایک گوشے اور ان کے حسین نظاروں کو عصری حسیت اور جاذبیت کے ساتھ غزل اور نظم کے پیرائے میں ڈھال دیا گیا ہے۔ ہندی اردو میں بولی جانے والی مخصوص لفظیات و محاورات کا استعمال ان کے یہاں جذبے کی شدت اور محسوسات کے والہانہ پن کے ساتھ ہوا ہے۔ عنبر بہرائچی کی شاعری میں سنسکرت شعریات کے علاوہ اودھی، برج، بھوج پوری کے الفاظ کی برجستہ آمد کی بنا پر نئی لسانی صورت گری وجود میں آئی ہے جس میں دھرتی کی بھینی بھینی مہک شامل ہے۔ ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے اپنے تحقیقی مقالے "طلسم ہوش ربا میں ہندوستانی عناصر" کی نشاندہی کرتے ہوئے اس جانب ذہن کو راغب کرایا ہے کہ جو اس یکجہتی کو پسند نہیں کرتے ہیں وہ دراصل امن و آشتی کے خیر خواہ نہیں ہیں ان سے ہر پل ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

ماضی کے دریچوں سے ذرا جھانک کر دیکھیے تو انگریزوں کی آمد سے قبل ہندو مسلم حکمراں ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار ہوتے تھے مگر اس کی نوعیت فرقہ وارانہ نہیں ہوتی تھی کیوں کہ عوام کو معلوم تھا کہ یہ محض زور آوروں کے بیچ اقتدار کی جنگ ہے جن کے نزدیک ملک و قوم کا مطلب تخت و تاج کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ رانا سانگا کی قیادت میں بابر کے خلاف محمود لودی، حسن خاں میواتی، صلاح الدین وغیرہ نے صف آرائی کی۔ رانا کے بیٹوں رتن سنگھ اور وکرمادتیہ کے بیچ باپ کے تاج اور طلائی کمر بند کے لیے حریفانہ کشمکش شروع ہوئی تو وکرمادتیہ نے بابر سے دوستی کرلی۔۔۔۔۔ اکبر اعظم کی مہارانا پرتاپ سے اور اورنگ زیب کی شیواجی سے لڑائی محض اقتدار کی جنگ تھی۔ ان میں مسلمان، ہندو راجاؤں کی افواج کا جز ہوتے تھے تو ہندو سپاہی مسلمان بادشاہوں کی فوج کے کمان دار۔ سید احمد شہید کی جنگ مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ہوئی تو کسی نے بھی مسلم سکھ لڑائی کا نام نہیں دیا۔ ان جنگوں کو جہاد یا دھرم یدھ سے صرف فتنہ انگیز عناصر تعبیر کرتے ہیں جو اصلاً سامراجی ذہنیت کے پروردہ ہیں کیوں کہ انگریز حکمرانوں نے اپنی بقا کے لیے دونوں فرقوں کو آپس میں لڑانا شروع کیا کہ یہ تناؤ ان کی حکومت کے استحکام کا ضامن تھا۔ انھوں نے محسوس کرلیا تھا کہ اشوکِ اعظم سے ٹیپو سلطان تک صاحب شعور حکمرانوں نے قومیت کے تصور کو بیدار کرنے، ملک کو متحد بنانے اور اس کی جغرافیائی قدروں کو عملی جامہ پہنانے میں فعال کردار ادا کیا ہے۔ وہ عوام کے احساس اور میل ملاپ کے جذبے کو چکنا چور کر دینا چاہتے تھے انھوں نے رفتہ رفتہ نسلی، قومی، لسانی، علاقائی تفریق کو مذہبی تعصب کا رنگ دینا شروع کیا۔ سادہ لوح عوام ان کے اس جال میں پھنس کر مندر مسجد، گرجا اور گردوارہ کے نام پر جامِ شہادت نوش کرنے کو رضامند ہوتے گئے جبکہ مذہب فرقہ پروری کا نام نہیں ہے۔ یہ حقیقتاً انسان دوستی، دادرسی، دردمندی ہے۔ احترام، اُخوت اور محبت ہے۔ اس کا اولین مقصد نیکی، راستی اور اخلاق کا فروغ ہے۔ ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات میں اسی پہلو کو ابھارنے کا جتن کیا ہے۔ حامد اللہ افسر کے الفاظ میں۔

مذہب کچھ ہو ہندی ہیں ہم
سارے بھائی بھائی ہیں ہم
پریم نے سب کو ایک کیا ہے
پریم کے شیدائی ہیں ہم
بھارت نام کے عاشق ہیں
بھارت کے شیدائی ہیں ہم

تلوک چند محروم کہتے ہیں۔

تو مسلم ہے کہ ہندو ہے غرض اس سے نہیں مجھ کو
محبت ہے وطن سے تجھ کو اتنا ہے یقین مجھ کو

متوجہ کرنے کا انداز ہر ایک کا جداگانہ ہے۔

اقبال لکھتے ہیں۔

تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تری جن کو سمجھا ہے برا تو نے
شکتی بھی شانتی بھی بھکتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

مذہب امن، انسانیت اور یکجہتی کی علامت ہے۔ یہ فلاح و بہبود کی طرف انسان کی دست گیری کرتا ہے۔ اسے علیحدگی کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے کیونکہ سبھی مذہب انسان کے ساتھ اچھا برتاؤ سکھاتے اور وطن سے محبت کا درس دیتے ہیں۔ یہی حال زبانوں کا ہے۔ جب جب اس نکتہ کو نہیں سمجھا گیا، حشر برا ہوا۔ بقول راہی معصوم رضا۔

اور نتیجے میں ہندوستاں بٹ گیا
یہ زمیں بٹ گئی آسماں بٹ گیا
شاخ گل بٹ گئی آشیاں بٹ گیا
طرزِ تحریر طرزِ بیاں بٹ گیا

"بٹوارے" کے نتیجے میں رقصِ ابلیس اس

"دھوپ، خوشبو، اوس، چنگاری، شفق، ویرانیاں ایک انا کی ضد میں تاریخ بیاباں ہو گئیں"
بی۔ پی۔ سریواستو رند 09711422058 ("ایوان اردو" جون 2014)

زمین پر ہوا۔

چشتی نے جس زمیں پہ پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا

یہ بہت چبھتا ہوا سوال ہے کہ انگریزوں نے ہمیں کیا کچھ دیا ہے اور ہم سے کیا کچھ چھین لیا ہے؟ اس روداد سے گریز کرتے ہوئے یہ ضرور ہے کہ ہماری موجودہ تہذیب میں وہ عناصر بھی شامل ہیں جو صرف یوروپین اقوام کی دین ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں نے بہت کوشش کی کہ انگریزی تہذیب سے اپنے دامن کو بچالیں مگر اس کے اثرات مرتب ہونے سے وہ نہ روک سکے۔ اور شاید یہ وقت کا تقاضہ بھی تھا------تاریخ گواہ ہے کہ آرین کے بعد ستواہن آئے، کشان آئے، ہُن آئے، ان سب نے اپنی انفرادیت کو آرین تہذیب میں مدغم کر دیا۔ مسلمانوں نے اپنی انفرادیت باقی رکھتے ہوئے اس ملک کو انھیں کی طرح اپنا لیا۔ وہ اپنی بنیادی تہذیبی شناخت باقی رکھنے میں کامیاب تو ہوئے مگر آپسی ملن نے ان کی سماجی قدروں کو بہت متاثر کیا جہاں سے گنگا جمنی تہذیب وجود میں آتی ہے۔ جبکہ مغربی اقوام نہ تو ہندوستانی تہذیب کو اپنا سکے اور نہ ہی انھوں نے اپنے حال و مستقبل کو مکمل طور سے ہمارے ملک سے وابستہ کیا۔ وہ اس ملک کو ایک ایسی عارضی چراگاہ کی طرح استعمال کرتے رہے جس سے مستفید ہونے کے باوجود بھی اس کی بہتری ان کا مطمحِ نظر کبھی نہیں بنی۔ یہی بات دانشوروں کو تلملاتی ہے اور وہ قوم کی بہتری کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔

ماضی کے اوراق کو پلٹیں تو راجہ رام موہن رائے، کیشو چندر سین جیسے بنگالی مصلحین سماج میں تبدیلی لانے کا جتن کر رہے تھے جس کا اثر صرف ہندوؤں پر ہی نہیں مسلمانوں پر بھی تھا۔ نواب سلطان جہاں بیگم اور سر سید احمد خاں بھی بیداری کے اسی مشن میں لگے ہوئے تھے۔ گارساں دتاسی اپنے ۵ر دسمبر ۱۸۶۴ء کے خطبہ میں لکھتا ہے:

"سر سید احمد خاں کی تحریک پر ابھی بمقام کلکتہ مسلمانوں کی ایک انجمن قائم ہوئی جس کا نام مجلس مذاکرۂ علمیہ اہل اسلام رکھا گیا ہے۔ سر سید احمد خاں نے ۶ر اکتوبر ۱۸۵۳ء میں اس انجمن کے جلسے میں تقریر کی۔ موصوف نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے یہ درخواست کی کہ اب وقت آگیا ہے کہ وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہوں اور اپنے بزرگوں کی طرح علم و حکمت میں اپنا نام روشن کریں۔"

(ص، ۴۳۶)

شاید بنگال کی بیداری کے پیشِ نظر ہی انگریز حکمرانوں نے گھبرا کر ۱۶ر اکتوبر ۱۹۰۵ء کو بنگال تقسیم کر دیا جس کی وجہ سے اگلے سال مسلم لیگ وجود میں آگئی۔ ہندو مسلم کی اس تخصیص کے ردِ عمل میں تحریکِ بائیکاٹ، سودیشی اور سوراج تحریک کا آغاز ہوا۔ دانشوروں نے ہندو مسلم اتحاد پر بھرپور توجہ دی۔ خطباتِ آزاد کے صفحہ نمبر ۲۶۳ پر درج ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد سے کسی نے جیل میں سوال کیا کہ موجودہ ہندو مسلم اتحاد کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے تو موصوف نے فرمایا:

"ہندو مسلم اتحاد یقیناً آج اس سے کہیں زیادہ موجود ہے جتنے کی ۱۲-۱۹۱۱ء میں، میں امید کرتا تھا لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اب تک اس درجہ تک نہیں پہنچا کہ ہم اس پر پوری طرح اعتماد کر سکیں------البتہ میرا یقین ہے کہ کوئی حقیقی رکاوٹ اس کام میں حائل نہیں۔ دنیا کی تمام قوموں سے کہیں زیادہ ہندو مسلمانوں میں دائمی اور حقیقی اتحاد ہو سکتا ہے بشرطیکہ باہم غلط فہمیوں کا خاتمہ کر دیا جائے------سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک دوسرے کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ مجھے نہایت رنج ہوتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ایک ہندوستانی انگلستان اور امریکہ کی تاریخ اور لٹریچر کو حفظ کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اس مذہب اور جماعت کو جاننے کی بالکل پرواہ نہیں کرتا جو صدیوں سے اس کے ہمسائے میں موجود ہے۔"

آزادیٔ ہند سے قبل ہندوستان کی علمی، ادبی اور سیاسی فضا کو تقویت پہنچانے والوں کی طویل فہرست ہے۔ اُس وقت جہاں مہاتما گاندھی، سی۔ آر۔ داس، لالا لاجپت رائے، موتی لال نہرو، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی جوہر، سبھاش چندر بوس، جواہر لال نہرو اور مولانا شوکت علی وغیرہ میدانِ سیاست میں موجود تھے وہیں ادبی محاذ پر حالؔی، شبلؔی، شررؔ، اقبالؔ، حسرت موہانؔی، ظفر علی خاںؔ، مولانا عبدالماجد دریا آبادی جیسے ادیب و شعرا اپنی تخلیقات سے عوام الناس کو متاثر کر رہے تھے۔ مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی، سید سلیمان ندوی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولانا بشیر احمد عثمانی اور مولوی حبیب الرحمٰن ایسے مذہبی علماء اپنے علم و فضل کے ساتھ ملک کے طول و ارض پر چھائے ہوئے تھے۔ ان عظیم اور متنوع شخصیات کی موجودگی میں مولانا ابوالکلام آزادؔ نے ادب کے میدان میں بھی ایک الگ راہ بنائی تھی۔

"سب اپنے مذہب کو بہتر سمجھتے ہیں کوئی کسی کی برتری تسلیم نہیں کرتا، نتیجے میں کتنے تصادم، کتنے فسادات، کتنی جنگیں ہوئیں۔"
بیگ احساس 09849256723 افسانہ "دھار" (ماہنامہ "تحریر نو" ممبئی فروری 2014)

یکجہتی، بھائی چارے اور قومی جذبے کے فروغ کی طرف ''گیتا نجلی'' اور ''قومی ترانہ'' کے خالق رابندر ناتھ ٹیگور بھی متوجہ ہوئے تھے۔ اُن کی شاعری میں متصوفانہ خیالات اور روحانی مسائل کا بے محابا اظہار ہے۔ افسانہ ''کابلی والا'' اور ناول ''راجرشی'' میں انھوں نے مذکورہ موضوع پر نہایت موثر انداز میں لکھا ہے۔ ۱۸۸۷ء میں شائع ہونے والا ان کا یہ تاریخی ناول دریائے برہم پتر کے کنارے آباد تری پرا کے شاہی گھرانے سے متعلق ہے۔ اس میں مغل شہنشاہ شاہجہاں کے بیٹے شجاع اور اس کے سپہ سالار رگھنشر رائے کے واقعے کو فوقیت دی گئی ہے۔ اور یہ اجاگر کیا گیا ہے کہ بنگال کے صوبے دار شجاع کی انصاف پسندی اور دریا دلی سے متاثر ہو کر مہاراج گوبند مانکیہ نے کوملا میں مغل شہزادے کی یاد میں سرائے، خانقاہ اور ایک عظیم الشان مسجد بنوائی جو شجاع کے نام سے مشہور ہوئی۔ ٹیگور نے منظر نامے کو اس طرح اُبھارا ہے کہ خانقاہ و مسجد مشترکہ تہذیب کی علامت بن جاتی ہے۔ مصنف کی وسیع النظری اور فکر کی گہرائی افسانے میں بھی نظر آتی ہے۔ پلاٹ کی بُنت اور پیش کش کی وجہ سے اردو، ہندی کے ادیب بھی بہت متاثر ہوئے۔ ان کے ناولوں اور افسانوں کے نہ صرف بڑے پیمانے پر ترجمے ہوئے بلکہ فنی ہنر مندی کے ساتھ آپسی بھائی چارے کے تصور کو بھی جذب کیا گیا ہے جس کا اظہار اور اعتراف کسی نہ کسی زاویے سے پریم چند، پنڈت بدری ناتھ سدرشن، اعظم کریوی، دیویندر ستیارتھی، سجاد ظہیر اور نیاز فتح پوری نے کیا ہے بلکہ ٹیگور کے کئی کرداروں کو اپنے فن پارے میں ڈھالا ہے۔ عصرِ حاضر میں انور قمر نے ''کابلی والا'' کے کردار کی توسیع کرتے ہوئے ''کابلی والے کی واپسی'' کے عنوان سے افسانہ لکھا ہے۔

دیوکی نندن کھتری ''چندر کانتا'' میں اس کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ کرداروں کی زبان ملی جلی نہ ہو، فضا اور ماحول بھی مشترکہ ہو۔ حالانکہ وہ ''بھوت ناتھ'' میں اسے پوری طرح نبھا نہیں سکے ہیں۔ مدعو ریش اس بابت لکھتے ہیں:

''چندر کانتا کے ہندو کردار بھی فارسی آمیز زبان بولتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ لفظوں کا استعمال کچھ اس چابکدستی سے کیا گیا ہے کہ عام قاری کو یہ زبان آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس زمانے کے اردو فارسی کے عادی قارئین کے لیے شاید یہی زبان موزوں رہی ہو۔ لیکن ''چندر کانتا سنتتی'' میں یہ تناسب بدل جاتا ہے۔ یہاں دھیرے دھیرے مسلم کردار بھی ہندی الفاظ کا استعمال کرنے لگتے ہیں۔ اب کرداروں کے اعتبار سے مثالی زبان استعمال کرنے کی پرواہ مصنف کو نہیں ہے اور ''بھوت ناتھ'' میں تو وہ بالکل بدل گئی ہے۔''

البتہ پریم چند اور ان کے معاصرین مذکورہ فضا کو پوری طرح قائم رکھتے ہیں، ترقی پسند مصنفین اسے اور بھی تقویت پہنچانے کا جتن کرتے ہیں۔ خواجہ احمد عباس اپنے افسانوی مجموعہ ''نیلی ساری'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی ترقی کا راز ہم آہنگی میں ہے، بھائی چارے میں ہے۔ آپسی میل جول اور اتفاق میں ہے۔ اس لیے میں ان چیزوں کے حق میں ہوں جو ہم آہنگی اور اتحاد کو فروغ دیتی ہیں اور ان سب کے خلاف ہوں جو ان کی کاٹ کرتی ہیں۔''

مانک بندوپادھیائے نے ''چھوٹا بوکل پور کے مسافر'' اور ''فنکار'' کے ذریعے مغربی بنگال اور شام بارک پوری نے ''پدما کی موجیں''، ''میگھنا کی لہریں''، ''جمنا کے دھارے''، ''سورج مکھی''، ''رجنی گندھا'' اور ''کرشنا چوڑا کے سایے میں'' مشترکہ تہذیب کے نشیب و فراز کو تیکھے لہجے میں اُبھارا ہے:

''ایسا لگتا ہے کہ میں بغیر دل و دماغ کا ایک روبوٹ ہوں۔ بٹن دباتے ہی میں کمپیوٹر کی طرح کام کرنے لگتا ہوں۔ مرضی، خواہش، تصور کچھ بھی اپنا نہیں۔ میں کٹھ پتلیوں کی طرح ناچ رہا ہوں......شاید غالب نے اسی کے لیے کہا تھا ''بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے'' میری نظر میں بھی دنیا ایک کھلونے کی

''یہ ہوس کی موج تجھ کو کہیں بے نشاں نہ کر دے ❖ اسے بڑھ کے خود بجھا دو جو چراغ گھر جلائے''
مہندی پرتاپ گڑھی 07897192460 (ماہنامہ ''آجکل'' مئی 2014)

طرح نظر آرہی ہے۔ اسکائی لیب سے دنیا کا ہر کھیل دیکھ رہا ہوں......... ایسے میں مجھے دنیا کے صرف دو روپ نظر آتے ہیں...... سچ اور جھوٹ - محبت اور فریب- تعمیر اور تخریب- فتح وشکست- ثواب وگناہ- خیر و شر - اندھیرا و اجالا.........."

(خلا کی سولی پر انسان)

ہندی کا مشہور ناول "کتنے پاکستان" کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں ہندوستانی تہذیب وتمدن کو ایک الگ انداز میں ابھارا گیا ہے:

"کتنا خوبصورت منظر ہے........ ہمارے والد شہنشاہ اکبر اس جھروکے میں کھڑے ہوکر طلوع ہوتے ہوئے سورج کی ہمیشہ عبادت کیا کرتے تھے۔ انھوں نے یہ رسم ہماری والدہ جودھا بائی سے پائی تھی۔ طلوع ہوتے ہوئے سورج کو سلام کرنا اور ڈوبتے سورج کو نماز کے ساتھ رخصت کرنا......... یہ تو ہماری ہندوستانی وراثت کا خاص حصہ ہے..... نور جہاں نے کہا۔"

اسی ناول کا ایک اور اقتباس دیکھئے:

"فیض آباد کی سڑکوں سے گزرا تو اسے سب ٹھیک ٹھاک سا لگا وہی بازار، وہی گہما گہمی اور وہی عام سی زندگی۔ مسلمان عورتیں برقعہ پہنے بازاروں میں خرید و فروخت کر رہی تھیں یا چوڑیاں پہن رہی تھیں۔ ہندو منیہار ان کی نازک کلائیوں میں چوڑیاں پہنا رہے تھے اور وہ برقعہ کا پلّہ اٹھائے کھلے منھ ان کے سامنے بیٹھی تھیں۔ وہ منیہار ان کے بھائی، چچا یا ماموں تھے۔" (کملیشور)

اردو ناولوں میں غدار، انقلاب، اور انسان مرگیا، لہو کے پھول، تلاشِ بہاراں، اداس نسلیں، خدا کی بستی خصوصاً آگ کا دریا میں مذکورہ زاویۂ نگاہ نہایت فنکارانہ ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔ ہندی میں اسی منظر و پس منظر کے تحت کملیشور "کتنے پاکستان" شانی نے "کالا جل" راجندر یادو نے "سارا آکاش" موہن راکیش نے "ملبے کا مالک" وی این رائے نے "شہر میں کرفیو" یش پال نے "پردہ" اور "جھوٹا سچ" میں محض فرقہ پرستی کی نشان دہی نہیں کی بلکہ اس نکتے پر خصوصی توجہ دی ہے کہ ہندوستانی معاشرے میں منفی ذہنیت کی ہمیشہ مخالفت ہوتی رہی ہے۔ کسی بھی مذہب، ذات یا فرقے نے اسے سراہا نہیں ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ تعصب، تنگ نظری اور فرقہ بندی کی لعنت ختم ہونے کے بجائے نئے نئے چولے بدل رہی ہے۔ جب تسبیح وزنار، دیر وحرم، شیخ و برہمن پیار کے ایک ہی دھاگے میں پروئے گئے ہیں تو پھر ایسا کیوں؟ مجھے منٹو کے افسانوی مجموعے "سیاہ حاشیے" کی ایک منی کہانی یاد آرہی ہے جو فسادات پر لکھی گئی۔ کہانی ہے:

"تم ہندو ہو یا مسلمین
مُسلمین
تمہارے پیغمبر کا کیا نام ہے؟
محمد خان
ٹیک اے......... جاؤ......"

دراصل تعصب، تنگ نظری اور فرقہ واریت کو وہی لوگ ہوا دیتے ہیں جو مذہبی قدروں کا صحیح شعور نہیں رکھتے ہیں۔ آیئے اس کو ایک اور انداز سے قاضی عبدالستار کے ہاں دیکھتے ہیں۔ اُن کا ناول "غبارِ شب" ہندو مسلم تنازعے کو عصر حاضر کے تناظر میں پیش کرتا ہے۔ یہ تنازعہ تعزیہ اور پیپل کے درخت سے شروع ہوتا ہے اور پھر پوری بستی کو اپنے نرغے میں لے لیتا ہے۔ جہام پور کا جاگیردار اس کا مرکزی کردار ہے جو ہندو مسلم بھید بھاؤ کو مجھ ہی نہیں پاتا ہے کیونکہ دونوں فرقے اس کے رعیت ہیں۔ دونوں اس سے اور وہ ان سے محبت کرتا ہے لیکن چودھری اقبال نرائن اور عنایت خاں کی سازشیں پورے ماحول کو پراگندہ کردیتی ہیں۔ اس سازشی ماحول میں اس کی نجمہ کسی اور کی ہو جاتی ہے اور اوشا اسے پاکستان بھاگ چلنے پر اکساتی ہے مگر وہ اس کے مشورے پر عمل نہیں کرسکتا:

"تم یہ مکان دیکھتی ہو، یہ جائیداد دیکھتی ہو، یہ نوکر چاکر دیکھتی ہو لیکن تم یہ نہیں

"کلاسیکیت اور جدیدیت سے مزین صدیق مجیبی کے اشعار عصری حسیت کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کا لب ولہجہ اور انداز بیان معتدل اور محتاط اس معنی میں ہے کہ وہ روایتی انداز کی پیروی کرتے وقت اپنے مخصوص تیور میں جدید طرز بیان اور نئی غزل کے تقاضے کو بھی عزیز رکھتے ہیں۔"
فرحت حسین خوشدل 08541014050 "صدیق مجیبی کی غزلوں میں عصری حسیت" (زبان وادب، اپریل 2014)

دیکھتیں کہ میری ایک بیوہ پھوپھی بھی ہیں جو اپنے پاندان کے لیے میرا منھ دیکھتی ہیں۔ ان کے پانچ بچے ہیں جو اسکول کی فیس کے لیے میرا دامن پکڑتے ہیں۔ میری ایک چچی ہیں جن کی دو بیٹیاں ہیں جو تم سے بڑی ہیں، جو مجھ سے بڑی ہیں، جن کی جوانی شادی کا انتظار کرتے کرتے سو گئی ہے۔ اس بستی کے بوڑھے بوڑھے آدمی ہیں جن کے سروں پر تلواروں کے ساتھ ایک یہ تلوار بھی لٹک رہی ہے کہ کہیں میں بھاگ نہ جاؤں، اور یہ مسجدیں ہیں جن میں کبھی میں نے نماز نہیں پڑھی، یہ مجھے اپنا محافظ سمجھتی ہیں۔ میں کہاں جاؤں، میں ان سب کو کہاں لے جاؤں۔''

نقل مکانی اور جغرافیائی و تہذیبی تبدیلی کے پس منظر میں اگر ہم دیکھیں تو مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے مہاجرین کے تجربات میں کچھ فرق رہا ہے۔ تقسیم ہند نے مغربی پاکستان جا کر آباد ہونے والوں کو جو زخم دیے تھے وہ رفتہ رفتہ مندمل ہوتے گئے لیکن مشرقی پاکستان میں اردو بولنے والے جہاجر ابھی اپنی دھرتی کے لمس اور دیرینہ روایت سے بچھڑ جانے کے احساس سے نکل بھی نہ پائے تھے کہ انھیں اپنے نئے وطن سے بھی اکھاڑ پھینکا گیا۔ وہ خستہ دل اپنے پرکھوں کے گھر لوٹے تو یہاں کا سیاسی، لسانی اور تہذیبی منظر بدل چکا تھا۔ نئے ماحول میں ان کے اپنے بھی انھیں گلے لگانے سے گھبرا رہے تھے۔ جبر و استبداد اور خوف و دہشت کے کوائف کو ''دو گز زمین'' اور ''بیان'' میں نہایت خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ ''دو گز زمین'' کا آغاز تحریکِ خلافت سے ہوتا ہے اور اختتام قیامِ بنگلہ دیش پر------غلامی سے نجات حاصل کرنے، وطن کی آزادی پر مر مٹنے اور پھر غریب الوطنی کے سفر میں بہار اور اس کے قرب و جوار کے لوگ جن مشکل راہوں سے گزرے، عبدالصمد نے ان تمام واقعات اور کیفیات کو ناول کا جز بنا دیا ہے۔ اس ناول میں اظہار کی بے باکی اور لہجے کے توازن کے ساتھ طنز کی آمیزش ناول کے اسلوب کو منفرد بناتی ہے۔ عبدالصمد ایسا طنزیہ پہلو اختیار کرتے ہیں کہ بات قاری کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں جا کر چبھ جاتی ہے:

''خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جناح صاحب کو کہ اردو کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے تھے سوائے 'پاکستان' کے لیکن پاکستان کی زبان اردو بنا دی۔''

ایک اور جملہ ملاحظہ ہو:

''حامد کو انھوں نے قریب بلا کر آہستہ سے پوچھا 'پاکستان سے آئے ہو؟ جی ہاں...... ماموں کو نہیں لائے؟ جی وہ تو مغربی پاکستان میں ہیں، میں مشرقی پاکستان سے آیا ہوں۔ کتنے پاکستان ہیں بابو؟ حامد سے کوئی جواب نہ بن پڑا سب لوگ خاموش تھے۔''

مشرف عالم ذوقی کے ناول ''بیان'' کا محور ہندوستان کی مشترکہ تہذیبی و ثقافتی اقدار کے زوال کا نوحہ محسوس ہوتا ہے۔ تہذیب کا تعلق انسان اور انسانی معاشرے کی تربیت اور بناؤ سے ہے۔ جس مقام پر مادی اور ذہنی ترقی میں توازن قائم ہو جاتا ہے، تہذیب اپنے اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتی ہے اور جب یہ افراط و تفریط کا شکار ہوتی ہے تو اس کا خمیازہ قوموں اور نسلوں کو جھیلنا پڑتا ہے۔ ''بیان'' اسی انتشار کا بیانیہ ہے۔ اس میں تقسیم ہند سے لے کر بابری مسجد کی شہادت تک کے اہم واقعات کا بے باک اور جرأت مندانہ اظہار ہے۔ بال مکند شرما جوش اور برکت حسین ناول کے مرکزی کردار ہیں جو دو مختلف مذہبوں کے ماننے والے ہیں لیکن جن کی تہذیب مشترک ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے رسم و رواج کا احترام کرتے ہیں کیوں کہ یہ ان کا ورثہ ہے مگر ''ہندتو'' کی آندھی بھائی چارے اور میل ملاپ کی جڑوں کو ہلا دیتی ہے جس کی وجہ سے محبت کے درخت میں مہکتے ہوئے پھولوں کے بجائے کانٹے نکلنے شروع ہوتے ہیں۔ ناول کے دونوں کردار معاشرے کے اس بدلتے ہوئے رنگ کو دیکھ کر حیرت زدہ اور ماتم کناں ہیں اور اس پر افسردہ بھی کہ ہم نے ماضی قریب کی منافرت اور قتل و غارت گری سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

انتظار حسین کے سفرنامے ''جستجو کیا ہے؟'' میں مصنف کی شخصیت کے ساتھ اس کے عہد کو مرکزیت حاصل ہے مگر ان دونوں سے زیادہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی جھلکیاں صاف جھلکتی ہیں۔ حیرت و استعجاب

''داؤ پر جس نے قبیلے کو لگا رکھا ہے ہم نے اس شخص کو سردار بنا رکھا ہے''
ریاض انور
(سہ ماہی ''اردو'' امراوتی جنوری تا مارچ 2014)

غالب کے اس مصرعے سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔

کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

ماضی کے در کھلتے ہیں، ان گنت سوالات ابھرتے ہیں۔ تقسیم ہند کا سانحہ کیوں کر پیش آیا؟ کاش ایسا نہ ہوتا۔ اپنے دبدبے کو ظاہر کرنے والے مکانات ومقامات خاک میں نہ ملتے، جن کی زیارت کو انتظار حسین آج بھی بے چین ہو جایا کرتے ہیں۔ کاش حسن عسکری ان کو پاکستان نہ بلاتے تو وہ مہاجر نہ کہلاتے، جڑوں کی تلاش میں نہ نکلتے---- لمبے عرصے کے بعد جب وہ ہندوستان آئے تو شدت سے احساس ہوا کہ وہ تاریخ کا ایسا موڑ تھا جس نے نہ جانے کتنوں کو اپنے دیار سے اُجڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کتنے لوگ مصائب میں مبتلا ہوئے، بسے بسائے خاندانوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ بکھری ہوئی یادوں کو سمیٹتے ہوئے وہ اپنے گھر کا خاکہ تیار کرتے ہیں:

"ہمارا گھر بھی خوب تھا۔ کہنے کو مسلمان محلے میں تھا لیکن دائیں بائیں، آگے پیچھے سب گھر ہندوؤں کے تھے۔ اصل میں یہ اس محلے کے بالکل آخر میں تھا جو شیخان محلہ کہلاتا تھا۔ آگے بازار شروع ہو جاتا تھا اور ساتھ میں ہندوؤں کے گھر۔ تو اس گھر کی آب وہوا اسلامی تھی مگر اردگرد کی فضا ہندووانی تھی۔ کیا خوب گھر تھا۔ چار قدم آگے چلو مندر کھڑا نظر آتا۔ چھ قدم پیچھے جاؤ تو اپنی مسجد میں پہنچ جاتے تھے۔ تو میں مندر اور مسجد کے بیچ اپنی چھت پر اس آزادی سے کٹی ہوئی پتنگوں کے پیچھے دوڑتا تھا کہ برابر والی چھتوں کو بھی اپنے میں شمار کر لیتا تھا۔ اس محل وقوع سے ایک فائدہ مجھے یہ پہنچا کہ ہولی اور دیوالی کے تہوار اپنے تہوار لگتے تھے۔" (ص،۳۱)

ڈاکٹر سیما صغیر اپنے مضمون میں لکھتی ہیں کہ جائے پیدائش کی کشش دہلی اور علی گڑھ کی گلیوں میں ماضی کے عکس تلاش کرتی ہے۔ جستجو کا دائرہ بڑھتا ہے اور برج بھومی کی سیر کراتا ہے۔ "برندابن کی کنج گلی میں" انھیں سکون ملتا ہے۔ اس حصے میں انھوں نے کرشن کی جائے پیدائش کو دوبارہ ڈھونڈنے اور بسانے میں چیتنیہ کی کوششوں کی پوری روایت کو بیان کیا ہے کہ کس طرح ایک بنگالی بھگت نے اپنے عاشق صادق کا ثبوت دیتے ہوئے اس جگہ کو پھر سے بسایا۔ محسن کاکوروی اور مولانا حسرت موہانی کو یاد کرتے ہوئے انتظار حسین ایک ایسے مندر کے پاس پہنچتے ہیں جس کا نام واجد علی شاہ مندر ہے۔ گوسوامی جی انھیں بتاتے ہیں کہ اسے واجد علی شاہ کے خزانچی نے بنوایا تھا۔ یہ خزانچی شاہ کو کتھک بھی سکھاتا تھا۔ نواب کی اسیری اور غدر کی تباہی کے بعد وہ لکھنؤ سے اپنی تمام دولت کے ساتھ نکلا۔ اس نے یہاں یہ مندر اس اہتمام سے بنوایا کہ جو نقشہ واجد علی شاہ کے دربار کا تھا اس کا عکس آ سکے۔ لہٰذا کہیں چوسر کی بساط بچھی ہے، کہیں پتنگ بازی کا نقشہ ہے---- اور پھر لکھنؤ کے ذکر میں کچھ رقت سی محسوس ہوتی ہے:

"وہ لکھنؤ بہر حال لکھنؤ ہے۔ موجود کو دیکھتا ہوں اور گزشتہ کو تصور میں لاتا ہوں۔"

تال کٹورے کی کربلا، بڑا امام باڑہ، چھوٹا امام باڑہ، حضرت عباس کی درگاہ کو دیکھا۔ شاہ نجف میں جھانکا۔ "دو ڈھائی دن میں آدمی کتنا کچھ دیکھ سکتا ہے اور ایسے شہر میں جہاں کا ہر اُجڑا کوچہ پکار کر بلاتا ہے کہ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ میں گئی رونقوں کا امانت دار ہوں۔"

ماضی کی خوشگوار یادوں کو ذہن میں بسائے ہوئے وہ متھرا، ایودھیا ہوتے ہوئے کاشی کی جانب رُخ کرتے ہیں---- بنارس، برہمن اور حسینی برہمنوں کے ذکر سے مشترکہ تہذیب کی گہری وابستگی اجاگر ہوتی ہے۔ اس کا بھی احساس ہوتا ہے کہ برِ صغیر ہند میں جو صدیوں تک میل ملاپ فروغ پاتا رہا اس کی اصل جڑیں انھیں میں پیوست ہیں جن کی آبیاری کی ضرورت آج اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

انتظار حسین جنھوں نے اردو فکشن کو ایک نئی راہ دی ہے "جستجو کیا ہے" میں بھی اساطیر، دیومالا، کتھا ساگر، واقعۂ کربلا اور الف لیلا کے توسط سے چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر بدلتے زمانے کے دباؤ کو منعکس کرتے ہیں۔ وہ حال اور ماضی، جمہوریت اور آمریت کی آمیزش اور آویزش سے سوال اُبھارتے ہیں کہ سرحدوں کے قائم ہونے سے پہلے دونوں جانب بسنے والی بستیاں اخوت ومحبت، امن وآشتی کا دم بھرتی تھیں مگر سرحدوں کے قائم ہو جانے کے بعد انجانے طور پر ہونے والی غلطیوں کی سزا کب تک بے گناہوں کو ملتی رہے گی اور کب امن و بھائی چارے کی فضا بحال ہوگی۔ اسی کی تلاش وجستجو ان اسفار میں نظر آتی ہے۔

(۲) "شراب میں اس طرح ڈوبے رہنے کے باوجود منٹو نے اپنی بیشتر تخلیقات میں دانش مندی کی بات کی ہے، اور فن کو بھی معراج عطا کی ہے اور اس کے فن کی یہ معراج افسانے میں ہی نہیں ان کے خاکوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔" محمد تسلیم اختر مدیر سہ ماہی
ابجد 09470120116 مضمون "سعادت حسن منٹو کی خاکہ نگاری" (سہ ماہی "آمد" جنوری تا مارچ 2014)

وقت کے ساتھ سماجی قدروں، برسوں پرانی دوستی اور بھائی چارگی، مشترکہ تہذیبی، ثقافتی اور اخلاقی قدریں اس لیے بھی کمزور ہوئی ہیں کہ ذاتی اور گروہی مفادات نے جنم لیا ہے اور اپنے سے مختلف ہر خیال اور رجحان کی مخالفت کے رویے نے زور پکڑا ہے۔ آج جو کچھ ہو رہا ہے افسانہ نگار حسین صرف اشاروں اشاروں میں اس کا بیان کرتے ہیں۔ اپنے عہد کے بھی حساس لوگوں کی طرح وہ مستقبل سے کچھ زیادہ امیدیں نہیں رکھتے لیکن ان کا مشاہدہ اور تجربہ انھیں یہ بھی بتاتا ہے کہ انسانی فطرت کے جو مثبت عناصر ہیں ان کو مستقل طور سے دبایا نہیں جا سکتا۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جن اقدار سے ہمارا ماضی وابستہ تھا وہ ختم ہو چکے لیکن ایسا نہیں ہے۔ وہ اقدار اور عوامل کسی نہ کسی شکل میں آج بھی زندہ ہیں اور بالکل غیر متوقع طور پر ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ سامنے کی بات کہ کشمیر جو آج جل رہا ہے وہ کل کیا تھا؟ منظور اختر نے افسانہ "جس دن بازار بند تھے" میں کشمیری پنڈتوں کے توسط سے وہاں کے مثالی بھائی چارے کو ایک جگہ ان الفاظ میں اُبھارا ہے:

"عید کے دن تمام ہندو
برادری کو لے کر رام لال
سرپنچ، عید گاہ میں مسلمان
بھائیوں کو مبارک باد دینے
جاتا ہے اور قریشی صاحب
دیوالی اور شیو راتری پر
مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں
کے گھروں میں شیرینی اور
پھل پیش کرتے ہیں۔"

مظہر امام کا یہ شعر ذہن پر ضرب لگاتا ہے۔

کوئی دیوار تو حائل تھی کہ ہم تم برسوں
ایک ہی گھر میں رہے پھر بھی شناسا نہ ہوئے

ناشناسائی کے بہت سے اسباب ہیں جن پر جاں نثار اختر کی نظم "قومی وحدت" ضرب لگاتی ہے تاہم کربناک صورتِ حال کو مثبت راہ پر لانے کے لیے ہمیں اسعد بھد رواہی کی طرح عہد کرنا ہوگا۔

ہم دھرتی کے سب لوگوں تک پریم کا رس پہنچائیں گے
ہم دُنیا کو امن و اماں کا سندیسہ دے جائیں گے
ہم ہیں ہند کے رہنے والے، پریم ہمارا مذہب ہے
پریم کے دانی پریم گیانی، پریم ہی کو اپنائیں گے
(نظم "پریم")

اتحاد و اتفاق اور رواداری کا پیغام نشاط کشتواڑی اہلِ وطن کو ان الفاظ میں دیتے ہیں۔

محفل میں اتحاد کی شمعیں جلاؤ تم
گلشن میں اتفاق کے گل بھی کھلاؤ تم
ناقوس و اذاں لحہ بہ لحہ سناؤ تم
گرنتھ بھی پڑھو تو شوق سے طبلے بجاؤ تم

آج کا ادب یہی تلقین کر رہا ہے کہ ہمیں ایسا ہی کرنا ہوگا۔ تلخیوں کو بھول کر خوشیوں کو گلے لگانا ہوگا ماضی قریب سے ماضی بعید پر نظر ڈالیے ولی اور بزرگوں کی بات نہیں چھوٹے چھوٹے صوفی سنتوں نے بھی دنیاوی آسائش سے چشم پوشی اختیار کر لی تھی نتیجتاً ان کے ماننے والے کسی نہ کسی زاویے سے اُس پر عمل کرتے تھے۔ علامہ اقبال اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں
بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا عاشق بنوں گا
جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

صاحبِ شعور اس نکتہ کو سمجھ گئے تھے کہ مذہب بنیادی طور پر دولت کے خلاف نہیں بلکہ اس کے ذرائع کے حدود کا تعین کرتا ہے۔ اس لئے ذرائع صحیح ہوں، خواہشات پر قابو ہو۔ حکمرانوں، سیاستدانوں کو تو چھوڑیے آج کے صوفی سنتوں نے بھی مادّیت کو قبول کر لیا ہے اسی لیے چہار جانب افراتفری ہے، نفسا نفسی ہے۔ اس انتشار بھرے ماحول میں جب کہ جنگی خطرات ہمارے سروں پر منڈلا رہے ہیں، اندرونی خلفشار اور بد امنی کی فضا ایکتا اور اتحاد کو تباہ کر کے ہماری تہذیب کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ یہ صورتِ حال شعوری و لاشعوری طور پر ہمارے ذہنوں میں عدم اعتماد، بے یقینی، شکوک اور نفرت کی چنگاریاں بھڑکا رہی ہے۔ جس کی بنا پر مایوسی، حال سے ناآسودگی اور ماضی سے بے اعتباری شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ ان حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ماضی قریب و بعید کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی، آپسی رواداری اور اخلاقی روایات کے اُن علمی اور عملی نمونوں کو منظرِ عام پر لایا جائے جن میں اتحاد، آپسی میل جول اور صلح و آشتی کے گیت گائے گئے ہوں۔

صارفیت کے اس دور میں، ہندوستان جیسے کثیر ثقافتی ملک میں مشترکہ تہذیب تبھی فروغ پا سکتی ہے جب باہمی افہام و تفہیم اور ادبی و ثقافتی سطح پر وسیع المشربی کو بروئے کار لایا جائے نیز لسانی اور ثقافتی انضمام پر اصرار کرنے کے بجائے وسیع تر انسانی اقدار کا پاس رکھا جائے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جارحانہ قوم پرستی کے بجائے "دستوری حُب الوطنی" (Constitutional Patriotism) کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ جرمن فلاسفر ہیبر ماس کے مطابق دستوری حب الوطنی کی اساس مساوی بنیادی حقوق کی فراہمی پر قائم ہے اور یہی ہمارے آئین کی بنیاد بھی ہے۔ بلاشبہ اس پر صدق دل سے عمل کر کے یکجہتی کو مزید تقویت بخشی جا سکتی ہے۔

❀❀❀

fikrnaulhr@ gmail.com (ایوان اردو دہلی مئی 2014)

افسانہ

ایک کرم اور

سیّد ظفر ہاشمی
09452813289

عزیز احمد سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو انھیں لگا کہ وہ کسی قید بامشقت سے آزاد ہو گئے ۔ گو کہ اسی قید و بند نے انھیں پیسے دیئے تھے جس سے انھوں نے گھر بار آباد کیا تھا ، اسے خوش اسلوبی سے چلایا تھا، محبت بھرے کنبہ کی پرورش اور پرداخت کی تھی ۔ اور معاشرے میں عزت اور وقار حاصل کیا تھا۔ جس کے لئے وہ اللہ کے شکر گزار تھے۔ پھر بھی ریٹائر ہوئے تو انھیں محسوس ہوا کہ چالیس سالہ سرکاری غلامی سے نجات ملی اور اب وہ آنے والے ہر شب و روز کو اپنا کہہ سکیں گے اور جس طرح چاہیں گے انھیں گزار سکیں گے ۔ ملازمت کے آخری دن دفتر نے انھیں الوداعیہ دیا تو وہ آبدیدہ تو ہوئے لیکن اندر ہی اندر خوشی بھی محسوس کی کہ تمام بندشوں ، ذمہ داریوں ، اور فرائض منصبی سے جان چھوٹی اور اب ہر پل ان کا اپنا ہوگا ۔ اس پر کسی کی اجارہ داری نہ ہوگی آفس کی بھاگ دوڑ نہ ہوگی ۔ کسی کا حکم ماننے اور کسی سے اپنا حکم منوانے کی کشمکش میں اب مبتلا نہ ہونگے ۔ جس طرح چاہیں گے جئیں گے ۔ انھوں نے آئندہ زندگی کا خاکہ بھی مرتب کر لیا تھا ۔ خانگی مصروفیات سے نبرد آزما تو ہونا ہی تھا کیونکہ زندگی کی ساری خوشیاں اسی چشمے سے سیراب ہوتی تھیں ۔ وہ تو بہر حال ان کے معمول میں شامل ہونگی ۔ مذہبی احکامات اور مطالبات کی پاسداری بھی ضروری ہوگی ۔ عزیزوں اور رشتہ داروں سے تعلقات مستحکم کرنے اور بعض صورتوں میں جہاں ملازمت کے جبر سے دوری یا دراڑ پیدا ہو گئی تھی اسے دور کرنے پر خصوصی توجہ دینی ہوگی ۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک فلاحی ادارہ کا نقشہ بھی اپنے ذہن میں ترتیب دے ڈالا تھا جس کے تحت وہ قوم و ملک اور اپنی زبان کی خدمت کرنا چاہتے تھے ۔ یہ ان کی ہمیشہ کی دلی خواہش رہی جسے ملازمت کی وجہ سے وہ پوری نہ کر سکے تھے ۔ اب وہ اس خواب کو شرمندۂ تعبیر ہوتے دیکھنا چاہتے تھے ۔ محلہ کی مسجد اور مدرسہ کی سرگرمیوں میں اب زیادہ وقت دینے کی خواہش رکھتے تھے ۔ اہل محلہ کو بھی ان کی سبکدوشی کا انتظار تھا کہ وہ فراغت پائیں تو ان کے علم سوجھ بوجھ تجربے اور صلاحیت کا بھرپور فائدہ اٹھایا جائے ۔ غرضکہ ہمہ وقت مشغول رہنے اور عوام سے خود کو جوڑے رکھنے کا مصمم ارادہ وہ پہلے ہی کر چکے تھے صرف وقت کا انتظار تھا جو آج شروع ہونے جا رہا تھا۔

آفس کو الوداع کہنے کے بعد وہ باہر نکلے تو دل آزادی کے احساس سے شرابور اور آنکھیں خوشنما خوابوں سے روشن تھیں ۔ انھیں گھر پہنچنے کی جلدی نہ تھی ۔ اس لئے گھر جانے کے بجائے گاڑی شاہراہ کی طرف موڑ دی اور اسے سست رفتار سے چلاتے ہوئے شہر سے باہر گاؤں کی طرف نکل گئے ۔ جنوری کی آخری تاریخ تھی ۔ شمالی ہند میں گو کہ سردیاں شباب پر تھیں لیکن آسمان صاف ، ہوا پُرسکون اور موسم خوشگوار تھا ۔ کھیتوں میں مٹر اور سرسوں کے لہلہاتے پھولوں کو دیکھا تو گاڑی سڑک کے کنارے ایک جگہ روک دی ۔ اور کھیتوں کی طرف نکل گئے وہاں دیر تک مٹر کے پھولوں سے کھیلتے اور سرسوں کے پھولوں کو سونگھتے رہے ۔ گنّے کا ایک کھیت دیکھا تو اس میں گھس گئے اور ایک گنّا توڑ لیا یہ جانتے ہوئے کہ یہ چوری ہے لیکن ان کا جی چاہا کہ وہ آج یہ چوری کر لیں ۔ اگر کوئی اعتراض کرے گا تو وہ اس گنّے کی قیمت بڑی فراخ دلی سے ادا کر دیں گے ۔ اس خیال سے انھوں نے اپنے ضمیر کو مطمئن اور اس غلط حرکت کا جواز ڈھونڈ لیا تھا ۔ ویسے وہ خود گاؤں کے تھے اس لئے گاؤں والوں کی وسعت قلبی اور دریا دلی سے واقف تھے کہ اگر گنّے کا مالک آ بھی گیا تو وہ اعتراض کرنے کے بجائے بڑی خوشی سے دو چار گنّے اور نذر کر دے گا ۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا ۔ صرف دور دور تک لہلہاتی فصلیں تھیں جن پر شبنم کے قطرے جو شام ہوتے ہی گرنے لگے تھے ، جھلملانے لگے تھے ۔ ان قطروں کو وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کے پوروں میں جذب کرنے لگے جس سے انھیں بڑی راحت ملی ۔ کچھ قطرے انھوں نے اپنی آنکھوں میں بھی ٹپکایا ۔ لڑکپن میں سنا تھا کہ شبنم کے قطرے آنکھوں کا جالا صاف کر دیتے ہیں ۔ واقعی انھوں نے آنکھوں میں تراوٹ اور تازگی محسوس کی ۔ بڑی دیر تک گلابی بیگنی کاسنی اور سفید پھولوں سے مزیّن مٹر کے پودوں کو

"شاد عارفی کے یہاں صرف سماج کی خرابیوں پر طنز ہی نہیں، محبت اور نفسیاتِ انسانی کی سچی تصویریں بھی ہیں اور انہیں ایک ایسے تیور اور بانکپن سے پیش کیا گیا ہے کہ فوراً ذہن پر نقش ہو جاتی ہے۔"
مظفر حنفی 09911067200 مضمون "شاد عارفی کے معاشقے اور ان کا تخلیقی ردعمل" (سہ ماہی "استفسار" جے پور، مارچ 2014)

ہاتھوں سے ہلکورے دیتے رہے ۔ سرسوں کے پھولوں کو نوچ نوچ کر ایک گچھا بھی بنالیا۔ گوکہ یہ بھی جرم تھا کئی پودے اپنی حرمت سے محروم ہو گئے لیکن انھوں نے اپنی شوخی میں اس حرکت کو بھی حرجانہ ادا کرنے کے ارادہ سے تقویت حاصل کر کے جائز قرار دے ڈالا ۔ اور جب اندھیرا پھیلنے لگا تو انھوں نے اپنے گیلے ہاتھوں سے منہ پونچھا اور شبنم سے بھیگا پیچھا تا چھڑا کے گھر کی طرف چل دیئے۔

شام کا مٹمگجا اندھیرے میں ڈھل چکا تھا۔ گھر کے افراد کو ان کے وقت پر نہ آنے سے پریشانی لاحق ہوئی ۔ انھیں پتہ تھا کہ آج ان کی ملازمت کا آخری دن ہے۔ گھر آنے میں تھوڑی دیر ہو سکتی ہے لیکن جب کافی دیر ہو گئی تو ان کے بیٹے عرفان نے موبائل پر رابطہ کیا لیکن موبائل کی گھنٹی کے ساتھ ان کی کار کا ہارن بھی بج گیا۔ گیٹ کھولا گیا اور ان کی گاڑی پورچ میں داخل ہوئی ۔ وہ کار سے اترے تو اس انداز سے کہ ایک ہاتھ میں گنے کی لٹھ تھی اور دوسرے میں سرسوں کے پھولوں کا گچھا تھا اور چہرے پر یہاں وہاں مٹر کے پھولوں کی نرم نازک پنکھڑیوں کی آرائش تھی جو منہ پر گیلا ہاتھ پھیرنے کی وجہ سے گالوں پر چپک گئی تھیں ۔ انھیں اس حلیہ میں دیکھ کر بیوی تو ہنس پڑیں لیکن بیٹے نے ناراضگی ظاہر کی

"کہاں چلے گئے تھے آپ ؟ یہ آفس سے سیدھے گھر آنے کی علامت تو نہیں ہے ۔ نہ ہاتھ میں نہ چہرے پر"

" ٹھیک سمجھے ۔" عزیز احمد نے بڑے خوشگوار موڈ میں کہا۔ " میں اپنی آزادی کا جشن منانے گاؤں کی طرف نکل گیا تھا۔

بیٹے نے باپ کی اس شوخی سے لطف نہیں اٹھایا۔ شاید ایسے لطیف مذاق سے اس کا سابقہ نہیں پڑا تھا جس میں گاؤں ہو، اس کی خوبصورتی ہو، وہاں کے کھیت کھلیان ہوں ، پیڑ پودے ہوں ، تال تلیا ہوں ، باغ بگیچے ہوں ، گنے اور مٹر کے کھیت ہوں ، ان کے پھولوں کی خوشبو اور مہکتی ہوائیں ہوں ۔ منہ بناتے ہوئے بولا

" آپ کو اس طرح لانگ ڈرائیو پر اکیلے نہیں جانا چاہیے تھا۔ اپنی صحت کا خیال رکھئے ۔ آپ کو اب احتیاط سے کام لیتے ہوئے آرام دہ زندگی گزارنا ہے ۔ آج آپ ریٹائر ہوئے ہیں ۔ ہم آپ کے لئے صحت مند عمر دراز کی خواہش رکھتے ہیں اور اس حوالے سے آپ کو ایک سرپرائز دینا چاہتے ہیں۔"

عزیز احمد مسکرائے ۔ " تبھی تو میں کہوں کہ تم لوگ سارے کے سارے پورچ میں کھڑے میری راہ کیوں دیکھ رہے تھے۔"

اس درمیان ان کی چھ سالہ پوتی نے ان کے ہاتھ سے گنا چھین لیا تھا اور بہو نے سرسوں کے پھولوں کا گچھا لے کر اپنے بالوں میں جیسے تیسے گھسیڑ لیا تھا۔ انھوں نے اپنی بیوی کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا " کیسی سرپرائز؟ چنے کا حلوہ بنایا ہے کیا؟"

عرفان نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا " چلئے دکھاتے ہیں ۔ چنے کے حلوے سے کہیں بڑھ کر ۔ آپ دیکھیں گے تو خوش ہو جائیں گے۔"

وہ ان کا ہاتھ پکڑے پکڑے جب برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا تو بڑی محبت اور ملائمت سے بولا۔ " دیکھئے سنبھل کر برآمدے کی سیڑھیاں ہیں ۔۔" عزیز احمد نے تعجب سے اپنے بیٹے کو دیکھا پھر قدرے جھنجھناہٹ سے بولے " لاحول ولا ۔۔ مجھے پتہ نہیں کہ یہاں سیڑھیاں ہیں؟ روز چڑھتا اترتا ہوں ۔ مکان میں نے بنوایا ہے ۔ مجھے معلوم ہے کہاں کیا ہے۔ اور یہ تم نے میرا ہاتھ کیوں پکڑ رکھا ہے۔ چھوڑو۔ " انھوں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ عرفان کی گرفت سے آزاد کر لیا ۔" ہوں ۔۔ سیڑھیاں ہیں ۔۔ مجھے بتاتے ہیں " وہ بڑبڑائے ۔

گھر کے اندر داخل ہوئے تو حسب معمول اپنے کمرے کی طرف بڑھے جہاں ان کے علاوہ ان کی بیوی کا بھی پلنگ تھا اور مدت دراز سے تھا۔ لیکن ان کے بیٹے نے انھیں ٹوک دیا۔ اُدھر نہیں ، اِدھر ۔۔ میرے کمرے کی طرف "

" کیوں؟ تمھارے کمرے کی طرف کیوں ؟ " انھوں نے حیرت سے پوچھا

" کیونکہ اسے آپ کے لئے تیار کیا گیا ہے ۔ اب آپ وہاں رہیں گے ۔ ہم لوگ مکان کے اوپری حصہ میں شفٹ ہو گئے ہیں" عرفان نے ملاحت سے سمجھایا

" مگر کیوں ؟" عزیز احمد نے ناگواری سے پوچھا۔ اس پر بیٹے نے وضاحت کی۔

" اب آپ کو مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ اسلئے ہم نے کئی دنوں کی پلاننگ کے بعد یہ کمرہ آپ کے لئے مخصوص کیا ہے جہاں آپ کے آرام و سکون کی ہر سہولت فراہم کی گئی ہے۔ چلئے دکھاتے ہیں"

با دل نا خواستہ عزیز احمد اس کمرے کی طرف بڑھے ۔ اندر داخل ہوئے تو عرفان نے کمرے کا جغرافیہ بیان کرنا شروع کر دیا

" یہ آپ کا پلنگ ہے ۔ جس پر نیا گدا لگا دیا گیا ہے اور سفید چادر بچھا دی گئی ہے ۔ اُدھر ایک میز ہے جس پر قرآن مجید پنج سورۃ اور دعاؤں کی دوسری کتابیں اور چند تسبیحیں رکھ دی گئی ہیں ۔ یہ سب اس لئے کیا گیا ہے کہ اب آپ اپنا زیادہ وقت عبادت کرنے اور آخرت بنانے میں صرف کریں ۔ دنیاداری بہت ہو چکی ۔ وہ اب آپ مجھ پر

"تم بن پار نہ لاگی نیا ۔۔۔ میں نے دکھوں کو جیت ۔۔۔"
ڈاکٹر فراز حامدی 09166779318 ("اردو گیت پہ بات چیت" صفحہ 81)

چھوڑ دیں۔ ویسے تھوڑی دنیا داری کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ دیکھئے یہ آرام کرسی ہے اسی کے پاس یہ دیکھئے اس تپائی پر ٹرانزسٹر رکھا ہوا ہے۔ آپ کو ریڈیو بی بی سی۔ سننے کا بہت شوق ہے نا۔ وہ پورا کرے گا ۔سامنے وہ دیکھئے دیوار پر نئے طرز کا وال ٹی۔ وی۔ بھی لٹکا دیا گیا ہے خبروں اور نعتوں سے محظوظ ہونے کے لئے۔ اس کا ریموٹ ٹی پوائے پر رکھا ہے۔ دیکھ لیں۔ آپ کی کتابیں اس کمرے کی الماری سے اس کمرے کی الماری میں سجادی گئیں ہیں۔ کبھی کبھی اُن سے بھی دل بہلا لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اُدھر دیکھئے کونے میں نماز کی چوکی ہے۔ بالکل نئی۔ خاص طور پر بنوائی گئی ہے۔ اس پر مصلّٰہ بھی بچھا دیا گیا ہے۔ ۔۔دیکھ لیجئے ۔۔۔"

عزیز احمد نے تمام چیزوں پر طائرانہ نظر ڈالی پھر بڑی بے بسی سے بیوی کو دیکھا اور پوچھا " یہ سب کیا ہے؟" اس پر بیوی نے چہک کر کہا

"عرفان کو آپ کی صحت اور آرام کا بیحد خیال رہتا ہے۔ یہ آپ جانتے ہیں۔ اسے معلوم ہے کہ آپ نے زندگی میں بڑی جدو جہد کی ہے۔ ہمارے آرام کے لئے آپ نے کیا کیا مصیبتیں نہیں اٹھائیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اب جب آپ ملازمت سے سبکدوش ہو گئے ہیں تو زندگی کے بقیہ دن آرام وسکون سے گزاریں ۔اس لئے اس نے گھر کے سارے جھمیلوں سے آپ کو آزاد کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا ہے"

"ہاں ابو۔" بہو بھی لہک کر بولی "ابھی تک بجلی کا بل ،انکم ٹیکس، ہاؤس ٹیکس، واٹر ٹیکس وغیرہ ادا کرنے آپ خود دربدر بھٹکتے تھے۔ اب یہ سارا کام ایجنسیاں کریں گی۔ آپ کو نہیں جانا پڑے گا۔ بینک کا کام عرفان خود دیکھ لیں گے آپ کے اے۔ ٹی۔ ایم۔ سے وہ پیسے بھی نکال لائیں گے یہ کام تو میں بھی کر سکتی ہوں۔ آپ کو گھر سے باہر جانے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ مسجد مدرسہ کے معاملات میں بھی آپ دخل دینا کم کردیں۔ چندوں کے لئے روز بحثا بحثی اور کبھی کبھی تو مارا ماری بھی ہوتی ہے۔"

چھوٹی بھی کب چوکنے والی تھی۔ وہ بھی بولی

" اور دادا اب آپ ہمارے ساتھ کھیلیں گے بھی نہیں۔ ابو کہہ رہے تھے کہ تم اکیلے یا پڑوس کے بچوں کے ساتھ کھیلنا"

"کیوں"؟۔۔ عزیز احمد نے پوچھا تو پوتی نے وضاحت کی

"ابو کہہ رہے تھے کہ میرے ساتھ کھیلنے اور اچھل کود کرنے سے کہیں آپ کا کندھا نہ کھسک جائے"

"کندھا"؟ ۔۔ عزیز احمد نے تعجب سے اپنی پوتی کو دیکھا

" ہاں اکندھا۔ گیند پھینکنے سے کھسک سکتا ہے۔ ایسا ابو کہہ رہے تھے۔ ہیں نہ ابو؟

چھوٹی نے اپنی بات کی تائید باپ سے کرانی چاہی لیکن عرفان نے اسے نظر انداز کردیا اور اپنے باپ سے مخاطب ہوگیا۔

" ابو ہمارا مطلب یہ ہے کہ آپ کو مکمل تحفظ فراہم کیا جائے اور ایسی کوئی صورت پیش نہ آنے دیں جس سے آپ کو ذرہ برابر بھی تکلیف ہو ۔اللہ نے ہمیں سب کچھ دیا ہے۔ میری تنخواہ بھی اچھی خاصی ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ آپ کے اپنے بینک کا بھی دم خم ہے "۔۔ وہ مسکرایا پھر اپنی بات جاری رکھی " ایسی صورت میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے اور اس کی عنایتوں سے فیضیاب ہونا چاہئے ۔ ۔۔کیوں امّی؟"

"اور کیا" ماں بیٹے سے فوراً متفق ہوگئیں ۔اس کے بعد وہ آگے بھی بولیں۔ " میں تو کہتی ہوں کہ آپ کو عرفان کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ وہ آپ کے بارے میں اتنی محبت اور خلوص سے سوچتا ہے۔ اللہ اپنے ہر بندے کو ایسا ہی فرمانبردار بیٹا عطا کرے۔ " اتنا کہہ کر انھوں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو دعا کی شکل میں اوپر اٹھایا اور زور سے کہا آمین۔

عزیز احمد نے دیکھا وہاں موجود تمام لوگوں کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھ گئے۔ سب تو سب وہ چھوٹی بھی ہاتھ اٹھائے ہوئے تھی ۔جس کے ساتھ کھیلنے سے ان کا کندھا کھسک سکتا تھا۔ عزیز احمد نے خود دعا کے لئے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ عقیدت اور شاید محبت سے بھرپور ان ہاتھوں کو عبرت سے دیکھتے رہے جو ان کے حق میں دعا کے لئے اٹھے تھے۔ پھر جب آمین کی دوسری صدا کے ساتھ سارے ہاتھ اپنے اپنے چہروں کو مس کرتے ہوئے نیچے گرے تو۔۔ عزیز احمد کو لگا کہ ان ہاتھوں کے ساتھ ان کے خوابوں کا حسین محل بھی دھڑام سے زمین پر آگیا۔۔ وہ سکتے میں آگئے۔ مری مری سی آواز میں انھوں نے بیٹے کو مخاطب کیا

" شکریہ ۔۔۔ تم نے میری آخرت سنوارنے کا پورا بندوبست کر دیا۔ اب مجھ پر ایک کرم اور کردو " اتنا کہہ کر وہ رک گئے اور فرداً فرداً وہاں موجود گھر کے سبھی افراد کو دیکھا جن کی نگاہیں سوال بن کر ان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ پھر انھوں نے اپنی بات مکمل کردی

" مجھے وہ جگہ بھی دکھا دو جہاں تم لوگوں نے میری آخری آرام گاہ کے لئے دو گز زمین محفوظ کر رکھی ہے"۔

❀❀❀

"آج نارنگ ساقی صاحب اردو ادب میں ایک لطیفہ باز اور لطیفہ گو کی حیثیت سے اتنی شہرت پا چکے ہیں کہ شاید ہی کوئی ایسا اردو جاننے والا ہوگا جو ان کے لطیفوں سے واقف نہ ہو۔"

نند کشور وکرم 011-22094419 مضمون "ادب دوست اور ادب نواز۔ نارنگ ساقی (میخانۂ اردو کا پیر مغاں، مرتبہ نذیر فتح پوری)

غزل

عزیز بلگامی
09900222551

ہے رسم و راہِ خوشامد کو چھوڑنے کا خیال
اُبھر رہا ہے دِلوں کو جھنجوڑنے کا خیال

دلوں کے بیچ روابط کا ہے خیال ہمیں
دلوں میں اُن کے، دِلوں کو ہے توڑنے کا خیال

ستاتا ہے بھی، کبھی منصفو! ستم کے بیچ
ستم گروں کی کلائی مروڑنے کا خیال

بنا ہی دیتا ہے مجبور، ظلم ہی کا دباؤ
کسے پسند ہے بستی کو چھوڑنے کا خیال!

جو کھینچتی ہے، رُخِ زن سے چادرِ عصمت
ستاتا ہے اُن آنکھوں کو پھوڑنے کا خیال

تباہیوں پہ عزیزؔ اب یہ تبصرے کب تک
اُبھاریے، رُخِ طوفاں کو موڑنے کا خیال

❁❁❁

غزل

عالم خورشید
09835871919

میں جس جگہ بھی رہوں گا وہیں پہ آئے گا
مرا ستارہ کسی دن زمیں پہ آئے گا

لکیر کھینچ کے بیٹھی ہے تشنگی میری
بس ایک ضد ہے کہ دریا یہیں پہ آئے گا

مہیب سائے بڑھے آتے ہیں ہماری طرف
کب اعتبار ہمیں زمیں پہ آئے گا

اب اس ادا سے ہوائیں دیے بجھائیں گی
کہ اتہام بھی خانہ نشیں پہ آئے گا

کمانِ وقت نے ہم کو ہدف بنایا ہے
کہیں سے تیر چلے گا ہمیں پہ آئے گا

اُڑا رہا ہوں غبارہ مگر پتا ہے مجھے
ذرا سی دیر میں واپس زمیں پہ آئے گا

خلوصِ دل سے ہوئے کب مذاکرے عالم
ہر ایک فیصلہ آخر "نہیں" پہ آئے گا

❁❁❁

غزل

احمد کمال حشمی
09433145485

وہ اور ہیں جو امارت پہ ناز کرتے ہیں
ہم آسماں کی کھلی چھت پہ ناز کرتے ہیں

ہماری پیاس کو دریا سلام کرتا ہے
ہم اپنی پیاس کی شدّت پہ ناز کرتے ہیں

یہ سادہ لوح سیاست سمجھ نہیں پائے
دیئے ہوا کی حمایت پہ ناز کرتے ہیں

بہت نوازا گیا ہے، ہمارے قاتل کو
ہم اپنی جان کی قیمت پہ ناز کرتے ہیں

خموشیوں کی صدائیں جو سُن نہیں پاتے
وہ کیسے اپنی سماعت پہ ناز کرتے ہیں

کیا نہیں ہے کبھی وار ہم نے پیچھے سے
عدو ہماری عداوت پہ ناز کرتے ہیں

کمالؔ کو ہے سخن دانی پہ غرور بہت
لو بونے بھی قد و قامت پہ ناز کرتے ہیں

❁❁❁

"نہیں کوئی نقشِ پا بھی جن پر ❁❁ ہم اُن زمینوں پہ چل رہے ہیں۔"
شاہد پٹھان 09351290512 (ایوانِ اردو فروری 2014)

غزل

رؤف خیر

بڑی کریہہ سہی چپکلی سے کیا لینا
موحدوں کو بھلا بدعتی سے کیا لینا

تجھے خبر بھی ہے، دُنیا ہے میری مٹھی میں
تو بھاگ جا، تری تتلی گلی سے کیا لینا

بہت دنوں سے مجھے پیاس نہیں لگتی
اسی لئے تری دریا دلی سے کیا لینا

تری ترازو میں پاسنگ ہے ہمارے لئے
تجھے ضمیر کی آواز ہی سے کیا لینا۔

ابھی تو اور، ترا رنگ دیکھنا ہے مجھے
ہے اِنتقام بھی لینا،ابھی سے کیا لینا

بس اتنا ہے کہ، ترا ساتھ چھوٹ جائے گا
تری ترقّی معکوس ہی سے کیا لینا

کہیں بھی وقت کسی دن بھی ٹھہر سکتا ہے
گھڑی گھڑی کسی نازک گھڑی سے کیا لینا

قلندروں کی طرح مست اپنے حال میں ہیں
رؤف خیر ہمیں اب کسی سے کیا لینا

❁❁❁

افسانچہ

زلزلہ

دیپک بدکی

09868271199

چند سال پہلے جب یوم جمہوریہ کے دن گجرات میں زلزلہ آیا کئی شہر تباہ ہو گئے۔ ہیسیوں لوگ جاں بحق ہو گئے، سیکڑوں لاپتہ ہو گئے اور لاکھوں آشیانے خاک ہو گئے۔ چند علاقے تو باہر کی دنیا سے بالکل کٹ گئے۔ ذرائع ابلاغ بحال ہونے میں بھی چار پانچ روز لگ گئے۔

اپنے اسٹاف کی حوصلہ افزائی کے لیے میں تیسرے روز کچھ کے ضلع بھج پہنچ گیا۔ محکمے کی عمارت اور اسٹاف کی حالت کا جائزہ لے کر تھوڑا بہت اطمینان ہوا۔ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ البتہ ہر طرف بچوں کی چیخ وپکار، والدین کی بَین اور بیواؤں کی آہ و زاری سنائی دے رہی تھی۔

بازار میں چلتے چلتے ایک دُکان پر نظر پڑی جہاں کچھ ہی دیر پہلے یگیہ کا اہتمام ہوا تھا۔ اب سامنے سڑک پر ہزاروں بے گھر غریبوں کو کھانا کھلایا جا رہا تھا۔

میرے تجسس کو بھانپ کر ایک ماتحت نے خبر دی۔ ”سر، اس دکان کا مالک بہت ہی خوش نصیب ثابت ہوا۔ دو دن کے بعد اس کے دو بچے اور بیوی صحیح سلامت ملبے سے برآمد کیے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بھگوان کا شکرادا کرنے کے لیے یگیہ کا آیوجن کیا۔“

مجھ سے رہا نہ گیا۔ بنا سوچے سمجھے اپنا ردِ عمل ظاہر کیا۔

”اور جن کے بال بچے مر گئے ان کو کیا کرنا چاہیے؟“

وہ مجھے ٹکر ٹکر دیکھنے لگا۔ اس کے پاس میرے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

❁❁❁

نظم

شاعر

خلیل راضی (مرحوم)

مرسلہ: سہیل اختر

0933440140

خرد کی جنبشِ پرواز پر بار گراں میں ہوں
سوا میرے جہاں کوئی نہیں ہوتا وہاں میں ہوں

گلِ نورستہ کی دھڑکن ہوں، خارِ نیم جاں میں ہوں
میں دل ہوں بے دلوں کا بے زبانوں کی زباں میں ہوں

سمٹ کر لذتِ کونین کو دل میں چھپایا ہے
مرا دل کھول کر دیکھو زمین و آسماں میں ہوں

ربابِ زندگی لیتا ہے درسِ نغمگی مجھ سے
ترنگِ شادمانی ہوں نوائے پُر فغاں میں ہوں

مرے افکارِ شائستہ میں ہے فردوس کی خوشبو
سلام و خلد و رضواں کا اکیلا باغباں میں ہوں

کنارا بحر الکاہل کا لہراتا ہوں دامن میں
سفینہ چھوڑ دے اللہ پر، وہ بادباں میں ہوں

دمِ ناقوس کی ہمراہ تکبیر و جرس بھی ہیں
جہاں کا درد ہے اور شاعرِ ہندوستاں میں ہوں

پگھلتا ہے کلیجہ بزم کی شمع منور کا
صدائے صورِ اسرافیل ہوں محشر بیاں میں ہوں

سرک جاتے ہیں میری آنکھ سے اسرار کے پردے
گذر لاہوت میں ہے اور خدا کا رازداں میں ہوں

چمن کے رنگ بے رنگی پہ دل ہے خوں چکاں راضی
غنیمت ہے کہ پھر بھی انجمن میں گل فشاں میں ہوں

❁❁❁

”نئی کہانی روشنی میں نہائی ہوئی زندگی کی سڑک کی پیاس ہے، جس کی چوڑی چھاتی ہر عہد کی تاریخ کی خاموش گواہ بنتی جا رہی ہے۔ زخم سے کہانی نہیں بنتی۔ زخم کی یاد سے نئی کہانی بن جاتی ہے۔“ خورشید حیات 09752475934 مضمون ”نئی کہانی: سمت و رفتار“ (سہ ماہی ”فکر و تحقیق“ نئی دہلی، اکتوبر تا دسمبر 2013)

افسانہ

آگ، راکھ اور دھواں

نور شاہ
09906771363

ابھی ابھی میری نگاہوں کے سامنے وقت کا تیز لاوا بہا۔ گرم اور سرد دھواں فضا میں تحلیل ہوتا رہا اور میرا ذہن آگ اور راکھ کے درمیان بے سوچ چلتا رہا اور پھر چلتے چلتے نہ جانے کیوں اور کیسے بے سبب تھم گیا۔

میں اپنی پلکیں اُٹھا کر دیکھتا ہوں!

اب میں چالیس برس قبل کی دُنیا میں لوٹ آیا ہوں۔ چالیس برس قبل جب میری زندگی رعنائیوں سے بھری پڑی تھی، میرا ذہن جوان تھا، میری سوچیں جوان تھیں اور میری محبت جوان تھی۔ زندگی کی ہر آہٹ رنگینیوں سے لبریز تھی۔ چالیس برس قبل اپنی زندگی کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے میں کوہ سلمان کے دامن میں کھڑے امراض سینہ کے ہاسپٹل کو دیکھ سکتا ہوں۔ چیڑ اور دیودار کے اَن گنت سرسبز درختوں کے درمیاں سپید رنگ کی ایک بڑی سی پُر رونق عمارت، پُر وقار تعمیر، دراصل ہاسپٹل کی یہ عمارت چالیس برس سے بھی زیادہ پُرانی ہے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، میرے ذہن میں سوچنے کی صلاحیتیں بیدار ہوئی ہیں، یہ عمارت تب بھی اسی جگہ صحت مندی کی علامت بن کر موجود تھی، پوری عظمت اور شان و شوکت کے ساتھ۔

آج میں جس کہانی کو چھیڑنا چاہتا ہوں اور آپ کو ہمراز بنانا چاہتا ہوں وہ چالیس برس قبل میری زندگی کے کورے کاغذ پر لکھی جا چکی ہے۔ اتنا طویل عرصہ گذرنے کے بعد اُس کہانی کا ایک ایک لفظ ، ایک ایک حرف بالکل اُسی انداز سے آج بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ آج بھی یہ کہانی اُسی انداز سے میرے ماضی کے دریچوں کو روشن کر رہی ہے۔

یہ کہانی یوں شروع ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔!

نیلما اور ششما دو بہنیں ہیں۔ آنٹی اُن کی ماں ہے۔ یہ لوگ پٹھانکوٹ سے یہاں آئے ہیں۔ اُن کے ساتھ ہے۔ صابر میرا دوست ہے اور میرے دوستوں کا دوست بھی۔ اُس نے اپنی زندگی کے چند خوبصورت برس کشمیر میں گذارے ہیں۔ وہ دراصل فرنیچر ڈیزائنگ کا انجینئر ہے۔ صابر کا ان لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں، لیکن جن لوگوں کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا اُن کے رشتے بن جاتے ہیں۔ ایسے رشتوں کو ابدیت مل جاتی ہے۔ یہ رشتے رنگ و نسل اور خون سے بلند ہوتے ہیں۔ صابر کا بھی اُن کے ساتھ ایسا ہی رشتہ ہے۔

ششما آگ ہے نیلما راکھ۔۔۔۔ آگ بجھ جاتی ہے تو راکھ بن جاتی ہے اور اُس راکھ سے دھواں اُٹھتا ہے۔۔۔ وہ دھواں میں ہوں اور دھیرے دھیرے فضا میں تحلیل ہو رہا ہوں۔

"ششما بہت خوبصورت ہے۔" بہت پہلے صابر نے مجھ سے کہا تھا، تب میں نے ششما کو دیکھا بھی نہ تھا۔

اور اب ششما میرے سامنے ہے۔

میں ششما کی طرف دیکھتا ہوں۔۔۔ مجھے ایک لوک گیت یاد آ رہا ہے۔ "مجھے بتا تیری جڑوں میں کون پانی دیتا ہے۔ جو تُو اس قدر سرسبز ہے، خوبصورت ہے، سُندر ہے۔"

"نیلما کو آپ کی ذمہ داری پر کشمیر میں چھوڑ کر جا رہی ہوں" آنٹی کہتی ہے۔

میں خاموش ہوں۔۔۔۔۔!

"آنٹی" صابر کہتا ہے۔ "آپ بالکل نہ گھبرائیں۔۔۔ نیلما کی دیکھ بھال ان کی ذمہ داری ہوگی۔ مجھے اپنے دوستوں اور اُن کی دوستی پر اعتماد ہے"۔

ششما مسکرا دیتی ہے۔ کتنی خوبصورت ہے یہ مسکراہٹ، جیسے گل لالہ کھل رہے ہوں۔

سارا دن صبح سے لے کر شام گئے تک کوہ سلمان کے دامن میں آباد امراض سینہ کے ہاسپٹل یا یوں کہیئے سینی ٹوریم میں نیلما کو ایڈمٹ کرانے میں گذر گیا۔

سینی ٹوریم کی یہ عمارت جیسے ایک ساز ہے اور اس ساز کو چھیڑنے والے چناروں کے ٹھنڈے سائے۔ سینی ٹوریم جہاں موت کے جراثیم پلتے ہیں، جس کے مکین خون اُگلتے ہیں اور اب ان میں نیلما بھی شامل ہو چکی ہے۔ آنٹی کی بیٹی اور ششما کی بہن۔۔۔۔!

صابر نے کہا تھا۔ "پانچ ماہ قبل نیلما کی صحت کتنی اچھی تھی، بھرا بھرا جسم، کتابی چہرہ، کسی کی نظر لگ گئی۔ ایک بار سینے میں بے حد درد کا احساس جاگا، خون اُگل دیا، ڈاکٹروں نے کہا۔۔۔ تپ دق ہے، علاج معالجہ کے لئے ہماچل یا کشمیر جانے کا مشورہ دیا۔۔۔ اور میں ان سب کو کشمیر لے آیا۔"

"میں سارا کشمیر دیکھنا چاہتی ہوں۔۔۔ سُنا

ہے بہت سُندر ہے۔'' ششما نے کہا۔

''ماما مجھے اس سینی ٹوریم میں کتنی دیر رہنا پڑے گا۔۔۔؟ میرا جی نہ لگے گا یہاں۔۔۔ یہاں تو زندہ ہو کر بھی موت کا احساس ہوتا ہے۔'' نیلما نے اپنی ماں سے کہا۔

''اپنی اپنی قسمت ہے۔ دونوں بہنیں ایک ساتھ آئیں۔ ایک خوبصورتی دیکھنے اور دوسری بد صورتی اپنانے۔''

مختصر سے لمحے ہیں لیکن سوچیں کس قدر طویل ہیں۔ زندگی کی بے رنگی میں وہی لمحے اپنے ہوتے ہیں جو اپنے ساتھ گذارے جا سکتے ہیں۔

''میں نے پنجاب کی ہریالیوں میں کتنے اور کیسے کیسے خواب دیکھے تھے'' نیلما کہہ رہی ہے۔ ''میں بھی پڑھنا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر بن کر بیماروں کی خدمت کرنا چاہتی تھی یا ٹیچر بن کر اسکول میں چھوٹی چھوٹی بچیوں کو پڑھانا چاہتی تھی۔۔۔ نرس بن کر جنگی محاذوں پر فوجیوں کے زخموں پر مرہم پٹی کرنا چاہتی تھی۔ ہاں اور بھی خواب سجائے تھے۔ ایک جیون کے، ایک گھر کے۔۔۔ کشمیر آئی بھی تو ایک روگ لے کر، بیمار بن کر۔۔۔!

باہر بارش ہو رہی ہے، میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوں۔ میری ہر طرف کتابیں بکھری پڑی ہیں۔ دراصل میرا گھر بھی کوہ سلمان کے دامن میں واقع ہے اور میرے کمرے کی ایک کھڑکی سینی ٹوریم کی جانب کھلتی ہے اور یہاں سے میں سپید پُر رونق عمارت کو بخوبی دیکھ سکتا ہوں۔ ایک ایک کمرے میں جھانک سکتا ہوں۔

''آپ کے کمرے کی ہر شئے کس قدر بے ترتیبی سے رکھی پڑی ہیں۔'' ششما مجھ سے پوچھتی ہے۔

''خود میری زندگی بے ترتیب ہے'' میں جواب دیتا ہوں۔

''کیوں نہ ہم مل کر اس بے ترتیبی کو ترتیب دیں'' ششما بولتے بولتے رُک جاتی ہے۔

سینی توریم کی خاموشیوں میں دبی دبی سی سسکیاں اُبھر رہی ہیں۔۔۔ یہ سسکیاں نیلما کی ہیں۔ آنٹی نے اپنا ہاتھ نیلما کے سر پر رکھا ہے اور خود دُور خلاؤں میں کچھ تلاش کر رہی ہے۔ ششما گلدان میں پھول سجا رہی ہے۔ صابر نیلما کے سامنے کھڑا ہے۔ اُس کی آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں اور میں سوچ رہا ہوں، یہ کیسے رشتے ہیں۔ ماں اور بہن خاموش ہیں اور صابر آنسو بہا رہا ہے اُس لڑکی کے لئے، جو نہ تو اُس کی بہن ہے اور نہ ہی محبوبہ۔

وہ سب پٹھانکوٹ لوٹ چکے ہیں۔

نیلما سینی ٹوریم میں ہے۔

وقت کے رتھ کا پہیہ تیز تیز گھوم رہا ہے۔ برف پگھل چکی ہے۔ بہار نے اپنے قدم جما لئے ہیں۔ نیلما کے جیون کے دروازے پر بہار نے دستک دی ہے اور وہ شادمانی کی دہلیز پر کھڑی مسکرا رہی ہے۔

''میں واپس کیوں جاؤں؟'' وہ مجھ سے پوچھتی ہے۔

''اب تم صحت مند ہو چکی ہو۔ یاد ہے نا تم نے پنجاب کی ہریالیوں میں کتنے اور کیسے کیسے خواب دیکھے تھے۔۔۔؟ ان خوابوں کی تعبیر کے لئے تمہارا جانا ضروری ہے۔ تمہاری ماں آ رہی ہے، ششما آ رہی ہے۔ صابر بھی آ رہا ہے۔''

سب لوگ آ چکے ہیں، لیکن یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔۔۔؟ ایک بار پھر میری نظروں کے سامنے وقت کا لاوا بہا ہے اور بے سبب جم گیا ہے۔

''ہاں! میں ششما ہوں۔''

''یہ سب کیا ہو گیا ہے، کیسے ہو گیا ہے۔۔۔؟''

نیلما کو لے جا رہے ہیں اور ششما کو یہاں چھوڑ رہے ہیں۔''

صابر کہتا ہے۔

''بیٹا ششما بیمار ہے، میری بچی بیمار ہے۔۔۔ وہ تپ دق۔۔'' یہ کہتے کہتے آنٹی خاموش ہو جاتی ہے۔ میں ششما کی طرف دیکھتا ہوں۔ اب ان آنکھوں میں کوئی آگ نہیں، کوئی شعلہ نہیں۔۔۔ بے زبان خاموش آنکھیں کچھ کہنا چاہتی ہیں لیکن ہونٹ ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔

اور اب میری یہ کہانی دوسری بہار آنے کے انتظار میں اختتام پزیر ہو جاتی ہے۔

چالیس برس بیتنے کے بعد بھی یہ بہار ابھی تک نہیں آئی۔ اس دوران کوہ سلمان کے دامن میں کھڑی یہ عمارت بھی بہت بدل چکی ہے، زندگی کے بہت سارے اُتار چڑھاؤ دیکھ چکی ہے۔ اس کا رنگ و رُوپ اُجڑ چکا ہے اس کے در و دیوار کی پُر وقار رونق بے رونق ہو چکی ہے۔ اب نہ یہاں چیڑ اور دیودار کے سرسبز درخت نظر آتے ہیں اور نہ ہی موسم خزاں کے لرزتے بکھرتے چنار کے پتّے۔۔۔ لیکن آج بھی یہاں لوگوں کی ایک بڑی بھیڑ نظر آتی ہے، بیمار بیمار سے اپنی صحت کی تلاش میں۔۔۔ لیکن اس بھیڑ میں ششما جانے کہاں کھو چکی ہے، گم ہو چکی ہے۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ وقت کا لاوا واقعی بہہ چکا ہے اور بے سبب جم کر رہ گیا ہے۔ لیکن چالیس برس گذرنے کے بعد بھی مجھے ایک اور بہار کا انتظار کیوں ہے۔۔۔ کیوں۔۔۔؟

''میری زندگی تو ختم ہو گئی، اب مجھے اپنی اولاد کو جینے کا موقع دینا چاہیے، اس لئے اپنے بیٹے شہپر خان ولد اکبر خان کو بلا شرکت غیرے اپنے فلیٹ کا جائز حق دار مقرر کرتا ہوں۔'' اقبال مجید 09893764746 افسانہ ''غلطی کہاں پر ہوئی؟'' (ایوان اردو دہلی، مئی 2014)

منی کہانی

لفٹ

سالک جمیل براڑ
09256033695

وہ ۲۶ جنوری کی ایک سرد رات تھی۔ ٹھنڈی اور تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ رات کے کوئی بارہ بجے تھے۔ پورا ماحول اندھیرے کی سیاہ چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ کہیں دور سے سناٹے کو چیرتی ہوئی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایسے میں شہر کے باہر بائی پاس روڈ کے مین چوک میں ٹریفک انسپکٹر گربچن سنگھ اپنے دو ساتھیوں سمیت سڑک کے دائیں طرف برگد کے پیڑ کے نیچے بیٹھے آگ کا مزہ لے رہے تھے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور انسپکٹر گربچن سنگھ کپکپا اُٹھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے ہوا اُس کے جسم کے آر پار نکل گئی ہو۔

"سالی۔۔۔ یہ سردی تو جان لے کر ہی رہے گی" وہ بڑبڑایا

چند لمحوں بعد گربچن سنگھ اپنی مونچھوں کو بل دیتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنی توند سے نیچے ڈھلک رہی پتلون کو اُوپر کھینچا اور ٹہلتا ہوا سڑک کے درمیان آ گیا۔ اُس نے اپنی پتلون کی جیب کو ٹٹولا۔ جس میں صرف دو پچاس کے نوٹ تھے۔ اسٹریٹ لائٹ کی دُھندلی روشنی میں دور تک پھیلی سیاہ ناگ کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑک پر اُس نے بے صبری سے دونوں طرف نظریں دوڑائیں۔ لیکن کچھ نظر نہ آیا۔

"سالا۔۔۔ سارا شہر ہی مر گیا ہے کیا؟" وہ ایک موٹی سی گالی دیتا ہوا بڑبڑایا۔

یوم جمہوریہ کی وجہ آج اس کا دھندہ بہت مندہ رہا۔ بہت سخت چیکنگ تھی۔ شہر میں داخل ہونے والے ہر ویکل کی مکمل تلاشی لی جا رہی تھی۔ کاغذات میں ذرا سی بھی کمی پر فوراً چالان کیا جا رہا تھا۔ اس حالت میں اوپر کا مال بننا بہت مشکل تھا۔ ڈیوٹی تو اس کی ختم ہو چکی تھی۔ مگر اب وہ ایک اچھے شکار کی تلاش میں تھا جس سے دن بھر کی کمی کو پوری کی جا سکے۔ ویسے بھی روزانہ بارہ بجے کے بعد گنتی رولنگ سے پانچ چھ مال سے بھرے ٹرک نکلتے ہیں۔ گربچن کے سو روپے فی ٹرک بندھے ہوئے ہیں۔ اس کے اصول کے مطابق اس روڈ سے گذرنے والے ہر ٹرک کو چاہے اس میں ایک نمبر کا مال ہو یا دو نمبر کا چاہے ٹرک اوور لوڈ ہو یا نہ ہو۔ بس اسے سو کا نوٹ دینا ہوگا۔ سو کا نوٹ نہ دینے والے کو گربچن کا غصہ بہت مہنگا پڑتا۔

انسپکٹر گربچن سنگھ نے اپنی ۲۵ سالہ ملازمت کا بیشتر حصہ اسی شہر کی نذر کیا ہے۔ گربچن کی پہنچ اوپر تک ہے۔ محکمہ کے سبھی بڑے افسروں سے اس کی جان پہچان ہے۔ کیوں کہ وہ ہمیشہ اُنہیں قیمتی تحفے پیش کرتا رہتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی شکایت بھی کرتا تو اسے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ کچھ ملتا ہے تو انسپکٹر گربچن سنگھ کی دُشمنی۔

پچھلے سال کی بات ہے۔ کوئی نیا ٹرک ڈرائیور تھا گربچن نے اسے روکنے کے لئے ہاتھ دیا اور کاغذات دیکھنے شروع کر دئے۔ کاغذات کے علاوہ ہر چیز مکمل تھی۔ اس نے اپنا چائے پانی مانگا تو ڈرائیور اکڑ گیا،

"کس بات کا چائے پانی، کوئی کمی ہے تو آپ چالان کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ تو پھر چالان کاٹ دیتے ہیں" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک ڈنڈا ٹرک کی ہیڈ لائٹ پر جما دیا، جو چکنا چور ہو گئی اور گربچن اپنے ساتھیوں سمیت ہنس ہنس کر ڈرائیور کا مذاق اُڑانے لگا۔ ٹرک ڈرائیور آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے گربچن کو گریبان سے پکڑ لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گربچن اور اس کے ساتھیوں نے مار مار کر اس کا بُرا حال کر دیا اور پھر پولس کی مدد سے اسے حوالات میں بند کر دیا گیا اور نشیلی چیزوں کی اسمگلنگ کرنے کا پرچہ داخل کروا دیا۔ ایسے بے شمار قصے گربچن کے نام سے مشہور ہیں۔

گربچن کو کچھ سردی محسوس ہوئی۔ وہ دوبارا آگ کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اسی بیچ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور نمبر دیکھتے ہوئے حیران ہو کر کان سے لگایا،

"ہیلو۔۔۔ کیا بات ہے دلجیت؟"

"جی ماں جی دی۔۔۔ طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے۔ آپ فوراً آ جاؤ۔۔۔ وہ بے ہوش پڑی ہیں اور آپ ہی کا نام لئے جا رہی ہیں۔"

"دلجیت۔۔۔ تو۔۔۔ تو ڈاکٹر کو بلا لے۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں آ رہا ہوں۔" گربچن کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"خدا نے بخشی ہے مجھ کو جو بھیک سانسوں کی ❖ یہ قرض وہ ہے جو مجھ سے ادا نہیں ہوتا۔"
ادھو مہاجن بسمل 09579449635 (مجموعہ "حرف غزل" صفحہ 29)

ایک دم گربچن کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں اور اس کے ہاتھ پیر کانپنے لگے تھے۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

"اوئے حاکم!۔۔۔۔ماں دی طبیعت بہت خراب ہے یار۔۔۔۔میں گھر جا رہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے گربچن نے پاس ہی پڑا لفافہ اُٹھایا، جس میں ماں کی دوائیوں کے علاوہ کچھ پھل تھے اور پاس ہی کھڑی سفید رنگ کی بلٹ موٹر سائکل پر سوار ہوا۔ شاید سردی کی وجہ کر ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ پھر مسلسل کئی کِکیں مارنے کے بعد وہ پھٹ پھٹ کی آواز سے اسٹارٹ ہوگئی۔ اب گربچن سنگھ ہوا سے باتیں کرتا ہوا اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔

انسپکٹر گربچن سنگھ کا گاؤں اسی روڈ پر واقع ہے۔ شہر سے کوئی دس بارہ کلو میٹر دور ہوگا۔ اس کی ماں پچھلے پندرہ دنوں سے زندگی اور موت کے ساتھ لڑ رہی تھی۔ گربچن کے والد کا انتقال اس کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ وہ اپنی ماں کی محنت کے صدقے ہی آج اس مقام تک پہنچ پایا تھا۔ وہ اپنی ماں سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ وہ من ہی من میں واہے گورو سے ماں کی خیریت کی دعاء مانگتا ہوا شہر کی حد سے نکلا ہی تھا کہ موٹر سائکل سے کھڑ کھڑ کی آواز آئی اور وہ بند ہوگئی۔ گربچن کِک پر کِک مارتا رہا لیکن موٹر سائکل اسٹارٹ نہ ہوئی چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا اور سائیں سائیں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک اسٹریٹ لائٹ جل رہی تھی۔ جو آندھی میں چراغ کا کام کر رہی تھی۔ وہ موٹر سائکل دھکیلتا ہوا لائٹ کے نیچے چلا گیا۔ اس نے ایک سوکھی ہوئی کمزور سی شاخ کی مدد سے پیٹرول چیک کیا۔ ٹنکی آدھی سے زیادہ بھری ہوئی تھی۔ وہ اپنی ہر ممکن کوشش کے بعد ہار گیا تھا۔ مگر موٹر سائکل اسٹارٹ نہ ہوئی۔

اس نے ماں کی خیریت پوچھنے کے لئے موبائل نکالا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کی چارجنگ ختم ہوگئی تھی۔ اب وہ بالکل بے یار و مددگار تھا۔ اس نے سوچا کہ شہر کی طرف واپس جائے تا کہ کوئی مدد مل سکے۔ اب وہ موٹر سائکل دھکیلتا ہو شہر کی اس حد پر واقع چوک میں آ چکا تھا۔ تھکاوٹ سے اس کے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اُبھر آئی تھیں۔ چوک کے تین راستے شہر کے اندر جاتے تھے اور چوتھا مین روڈ تھا۔ اس نے موٹر سائکل ایک طرف لگا دی۔ اردگرد کی دکانیں اور چائے کے ڈھابے سب بند تھے۔ دور سے بوڑھا چوکیدار سیٹی بجا کر لاٹھی زمین پر مارتا ہوا آ رہا تھا۔ اب تو وہ کسی سے لفٹ مانگ کر ہی گھر پہنچ سکتا تھا۔ کیوں کہ کسی موٹر سائکل میکنک کا ملنا اس وقت ناممکن تھا۔ وہ نڈھال ہوکر ایک ہوٹل کے چبوترے پر بیٹھ گیا اور بجھی ہوئی انگیٹھی کو چھیڑنے لگا۔ وہ ماں کے ساتھ گذاری خوش گوار یادوں کے سمندر میں ڈوب گیا۔ اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکلے اور داڑھی میں پیوست ہو گئے۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ کہیں ماں اس کے پہنچنے سے پہلے مر نہ جائے۔ وہ جذباتی ہوکر بڑبڑایا،

"نہیں نہیں۔۔۔ماں تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

وہ بے چین ہوا اُٹھا اور چبوترے سے اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ انتظار کا ایک ایک لمحہ بہت بھاری پڑ رہا تھا۔ مسلسل پندرہ منٹ کے پہاڑ جیسے انتظار کے بعد دائیں طرف سے ایک روشنی دکھائی دی۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ شاید کوئی ٹرک ہے۔ اس کو تسلی ہوگئی۔ جب ٹرک اس کے قریب آ گیا تو اس نے سڑک کے درمیان میں جا کر سیٹی بجائی اور ہاتھ دے کر موٹر سائکل پر پڑا لفافہ اُٹھانے کے لئے بھاگا جس میں اس کی ماں کی دوائیوں کے علاوہ کچھ پھل تھے۔ ٹرک رُک گیا۔ گربچن کے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا اور وہ جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ "اب مجھے ماں سے ملنے سے دنیا کی کوئی بھی طاقت نہیں روک سکتی۔۔۔۔کوئی بھی نہیں۔" وہ من ہی من بڑبڑایا۔

جیسے ہی وہ ٹرک کی طرف لپکا ڈرائیور نے ٹرک کی کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالا اور سو کا نوٹ ہوا میں اُچھال دیا۔ اس سے پہلے کے گربچن کچھ بولتا ٹرک دھواں اُڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

❁❁❁

نبض شناس

رؤف خوشتر
0944094564

"ارے ونود! بھئی تم نے یہ کیسے پہچان لیا ہے کہ ہمارا رمضان کا مہینہ آ گیا ہے؟"

بے اختیار ونود کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تیر گئی "بالکل معمولی سی بات ہے سیٹھ جبار! تم نے ابھی کہا کہ ایک مہینہ کے ہیلتھ چیک اپ کے لئے امریکہ جا رہے ہو تو میں سمجھ گیا کہ۔۔۔۔۔۔۔۔

❁❁❁

"اخلاقی نکتہ نگاہ سے افسانہ "یزید" کے کریم دادا کو صرف سامنے لایا جائے تو ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ واقعی منٹو کی اخلاقیات، انسانیت کی کس بلندی کو چھوری ہے۔" پروفیسر قمر جہاں 09431422270 مضمون "منٹو کے افسانے میں اخلاقی قدریں" (سہ ماہی "کسوٹی جدید" سمستی پور جنوری تا مارچ 2014)

منی کہانی

سوغات

نذیر احمد یوسفی
08436030688

صبح سویرے مچھلی بازار جانے کی نیت سے نکلا تو اس رکشہ والے پر نظر پڑ گئی، وہ ڈاکٹر بختیار نواز کے "مزدور دواخانہ" کے باہر اُداس بیٹھا تھا، شاید اپنے نمبر آنے کے انتظار میں، سوجے ہوئے چہرے اور چوٹ کے کئی واضح نشانات کے ساتھ

میں ٹھٹھک گیا، بڑے صاف ستھرے دل کا مالک یہ نوجوان رکشہ والا، اپنے اندر ایک مخصوص خوبی یہ رکھتا تھا کہ کبھی کبھی بھیڑ میں جگہ بنانے کے لئے اپنے منہ سے سائرن کی سی آواز نکال لیتا تھا، ویسی ہی جیسی پولس گاڑی ایمرجنسی میں سڑکوں پر ٹرافک کو الرٹ کرنے یا کسی منسٹر و بڑے حاکم کی سواری کے لئے راستہ صاف کرنے کی غرض سے بجاتے ہوئے دوڑتی ہے۔

مجھے جلدی نہیں تھی، اس لئے ایک کنارے بنے سیمنٹ کے چبوترے پر بیٹھ گیا، اس کا نمبر آ گیا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد نکلا تو اس کی چوٹوں پر دوائیاں لگی ہوئی ملیں اور ہاتھ میں درد کو دور کرنے والی دوائیوں کی پڑیاں۔

اُس نے مجھے سلام کیا۔

میں نے پوچھا، "خیریت تو؟ اتنے سویرے اور اتنے سارے زخم، کہیں لڑائی بھڑائی ہو گئی تھی کیا؟"

وہ منہ بنا کر سسک پڑا۔

"نیکی کیا تھا اسی کی سزا ملی ہے۔"

میرا دل بھر آیا، میں نے اُس کے کندھے پر ہمدردی کا ہاتھ رکھا اور سامنے کی چائے دکان میں داخل ہو گیا، چائے کی چسکیوں کے درمیان، اُس نے رات کی روداد سنائی۔

"سواری کی تلاش میں رات گیارہ بجے کے سناٹے میں لکشمی ٹاکیز کی بغل والی گلی سے گذر رہا تھا کہ آگے کی سڑک پر سے ایک چھوٹی سی کار گزری، "بچاؤ بچاؤ" کی چیختی ہوئی نسوانی آواز کے ساتھ ۔۔۔ اِن دنوں زور زبردستی کی بہت ساری خبریں اخباروں میں آ رہی ہیں۔ چنانچہ "بچاؤ بچاؤ" کی آواز سن کر میں چونک گیا اور اندھیرے میں آگے بڑھ کر وہی پولس سائرن والی آواز نکالنے لگا۔

دوڑتی ہوئی کار آگے کے ایک بنگلے کے پاس پہنچ چکی تھی، ایک جھٹکے سے رُک گئی اور اُس میں سے کسی نے کسی کو دھکیل کر گرایا اور کار بنگلے کے اندر چلی گئی۔ جو چیز گری تھی وہ شلوار سوٹ میں ملبوس ایک گورے رنگ کی لڑکی تھی، میں نے پلک جھپکتے اُسے اپنے رکشے پر بٹھایا اور اُس کے گھر پہنچا دیا۔

سوچا پولس کو یہ بات بتا کر کچھ شاباشی لینی چاہیئے، اس لئے تھانے پہنچ گیا اور ڈیوٹی پر تعینات او۔سی کو ساری باتیں بتائیں"

اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔

"پھر کیا ہوا؟" میرا تجسس بڑھ رہا تھا۔

"ہوتا کیا؟ اُس نے پہلے تو مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا، پھر یہی چوٹیں اور درد کی سوغات دے کر مجھے وہاں سے بھگا دیا۔ رات بے چینی سے گذارا کہ غریبوں کا یہ دواخانہ ۸ بجے کے بعد کھلتا ہے۔"

"حیرت ہے! اُنہوں نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا؟ یہ تو بڑی اچھی بات تھی۔ پولس کو تو فوراً تمہارے ساتھ چل کر اُس بلڈنگ پر ریڈ (Raid) کرنا چاہیئے تھا کہ ایک حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔"

"بھلا کیسے آتے وہ میرے ساتھ؟"

"کیوں؟"

"کیوں کہ اُس بلڈنگ کے گیٹ پر اُسی او۔سی کا نام چمک رہا تھا۔"

"ہش ۔۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"غلط فہمی! جسونت سنگھ نام تھا اُس جلاد کا ۔ ابھی اُسی کی تصدیق کر کے دواخانہ آیا تھا"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ اُس گاڑی میں یقیناً اس کے آوارہ اور اوباش لڑکے رہے ہونگے۔ ورنہ ایسا کیوں ہوتا؟"

❀❀❀

"اے چشمِ شوقِ دل کے سفینے کی خیر مانگ ✿ دریا چڑھاؤ پر ہے کسی کے شباب کا۔"
غلام دستگیر نثر 08349885721 (ماہنامہ "شاعر" بمبئی جنوری فروری 2014)

افسانچے کا آغاز و ارتقاء: تحقیقی و تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری
09456259850

تغیر، ہمیشہ ہر عہد میں وقوع پذیر ہوتا رہتا ہے۔ تغیر نئے جہان معنی کی تعمیر کرتا ہے۔ تغیر ہمیشہ آگے بڑھتے رہنے کے لیے حوصلہ اور ہمت عطا کرتا ہے۔ اسی تغیر کی بنا پر تحریکات و انقلابات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ادب میں بھی تغیر کے شانے پر نت نئے Shades آتے جاتے رہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب طویل داستانیں عوام و خواص میں مقبول تھیں۔ ہفتوں اور مہینوں ایک ہی داستان اپنے مختلف رنگوں، تحیر و تجسس، داستان گو کے انداز اور لہجے کے اتار چڑھاؤ کے دم پر اپنے سامعین کو باندھے رکھنے میں کامیاب رہتی تھی۔ قتل کی سزائیں بھی، داستانوں کے زیر اثر تبدیل ہو جایا کرتی تھیں۔ وقت نے کروٹ بدلی۔ صنعتی انقلاب نے لوگوں کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔ اب لوگوں کو کام ملنے لگا۔ فرصت کے لمحات اپنا بدن سمیٹنے لگے۔ طویل داستانوں کی جگہ قصوں اور حکایتوں نے لے لی۔ کم وقت میں ختم ہونے والے قصے عوامی پسند بن گئے۔ ایک بار پھر وقت نے پلٹا کھایا۔ انسان کی مصروفیت میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ ۱۹ویں صدی کے نصف اول کے بعد ناول سامنے آیا۔ ناول کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ داستان کی مقبولیت میں بتدریج کمی واقع ہوتی گئی۔ ناول نے زندگی کے حقائق کو کچھ اس طور پیش کرنا شروع کیا کہ آہستہ آہستہ عوامی پسند بنتا گیا۔

ابھی ناول مقبولیت کے آسمان سر کر ہی رہا تھا کہ افسانہ کا بھی وجود سامنے آ گیا۔ افسانے نے مقبولیت کے نئے آسمان سر کیے۔ ناول بھی بتدریج عروج پذیر ہوتا رہا۔ افسانے کا گراف بھی مسلسل بلند ہوتا رہا۔ اسی دوران افسانچے نے بھی ادب میں قدم رکھا۔ ابتدا میں افسانچے کو خاطر خواہ پذیرائی نہیں ملی۔ لیکن آزادی کے بعد افسانچے نے اپنے قدم جمانے میں کامیابی حاصل کر لی۔

بعض حضرات کا ماننا ہے کہ اردو میں افسانچے، مغرب کے او۔ ہنری اور خلیل جبران کی تقلید میں سامنے آئے۔ میرا خیال ہے ایسا کہنا غلط ہو گا کیوں کہ مغرب میں تو نہ جانے کیا کیا، کس کس طور لکھا جاتا ہے۔ 55 فکشن، سو الفاظ پر مشتمل drabble فلیش فکشن، مائکرو فکشن اور تازہ بہ تازہ پوپ کہانی، وغیرہ وغیرہ الم غلم اصناف Writing Fashion کے طور پر رائج ہیں۔ ان میں سے کتنی، ہندوستانی ادب خصوصاً اردو نے قبول کیں۔

اگر منٹو نے او۔ ہنری یا خلیل جبران کی نقل یا تقلید میں یہ حاشیے، قلم بند کیے تھے، تو منٹو کو علم ہوتا کہ وہ ایک نئی صنف اردو میں متعارف کرا رہے ہیں اور ایسا کرتے وقت منٹو اس صنف کے موضوعات، ہیئت، اجزائے ترکیبی وغیرہ کا بھی لحاظ رکھتے لیکن ایسا کچھ بھی سیاہ حاشیے میں نظر نہیں آتا جو دانستہ طور پر تحریر کیا گیا ہو۔

افسانچہ لفظ اردو میں کب استعمال ہوا اور کس کے ذریعہ ہوا؟ یہ ایک تحقیق طلب امر ہے۔ یہ بات تو تسلیم شدہ ہے کہ افسانچہ اردو میں سعادت حسن منٹو کے سیاہ حاشیے سے شروع ہوا۔ سیاہ حاشیے کی اشاعت اول اکتوبر ۱۹۴۸ء میں عمل میں آئی۔ اس عہد میں اردو میں لفظ افسانچہ رائج نہیں تھا۔ یہی سبب ہے کہ پروفیسر محمد حسن عسکری نے منٹو کے سیاہ حاشیے کو افسانے ہی کہا ہے، ہاں کہیں کہیں وہ انہیں لطیفے بھی کہہ گئے ہیں جو سیاہ حاشیے اور سعادت حسن منٹو دونوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔ میں نے لفظ افسانچے کے سب سے پہلے استعمال کی تحقیق شروع کی تو کوئی خاص نتیجہ نہیں ملا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ افسانچے سے قبل ان کے لیے استعمال ہونے والے متعدد الفاظ منی کہانی، مختصر ترین افسانہ، مختصر مختصر کہانی، منی افسانہ، سامنے آئے۔ افسانچہ کے تعلق سے موجودہ عہد کے افسانچہ نگاروں اور ناقدوں میں بشیر مالیر کوٹلوی، عظیم راہی، ایم اے حق، مناظر عاشق ہرگانوی سے گفتگو کی۔ رسائل کے پرانے شمارے دیکھے۔ کتب خانوں کی خاک چھانی۔ اس سلسلے میں عظیم راہی نے بتایا کہ ان کی جوگندر پال سے ۱۹۸۱ء میں گفتگو ہوئی تھی۔ لفظ افسانچہ انہیں کا دیا ہوا ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی نے مدلل تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ انہیں جوگندر پال نے کسی انٹرویو میں بتایا تھا کہ انہوں نے ۱۹۶۲ء میں افسانچہ کا استعمال کیا۔ اس کی تصدیق رتن سنگھ نے بھی کی بلکہ رتن سنگھ نے اس سلسلے میں اپنی

"اردو دُنیا کی اس کامیابی نے اردو رسائل کی دُنیا میں یہ پیغام پہنچا دیا کہ سماج کے بدلتے ہوئے تقاضوں اور نئی ضرورتوں کی مطابقت میں ملی جلی نوعیت کے ادبی اور نیم ادبی قسم کے اردو رسالے شائع کئے جائیں تو لوگ انہیں شوق سے پڑھیں گے۔"

نصرت ظہیر 011-49539000 مضمون "اردو رسالے اور اردو" (اردو دُنیا، نئی دہلی اپریل 2014)

رائے قدرے مختلف بیان کی۔ انہوں نے مجھے ٹیلیفون پر بتایا کہ وہ اصناف کی تقسیم اختصار یا طوالت کے اعتبار سے نہیں مانتے۔ یہی سبب ہے کہ وہ طویل افسانہ، طویل مختصر افسانہ، مختصر افسانہ، منی کہانی، مختصر مختصر افسانہ، افسانچہ وغیرہ کو تسلیم نہیں کرتے۔ کہانی کو صرف کہانی ہونا چاہیے، وہ Piece of Art ہو بس۔ خواہ وہ طویل ہو یا مختصر، دو سطر کی ہو یا سو سطروں پر مشتمل۔ جوگندر پال بھی کچھ اسی قسم کے خیالات رکھتے ہیں:

"تحریر ذی جان ہونے کا انحصار دراصل اس امر پر ہوتا ہے کہ اس کے وجود سے ہی اس کی ذات کا ادراک ہو جائے۔ ہمارا وجود بڑا یا چھوٹا، اسی لیے ہمیں بوجھ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے سارے اجزاء داخلی اور مقامی ہونے کے باعث عین متناسب ہوتے ہیں۔ کہانی اگر اپنے اصل تناسب سے باہر نہ ہو تو ایک سطری ہو کر بھی پوری کی پوری ہوتی ہے ورنہ اپنی تمام تر طوالت کے باوصف ادھوری کی ادھوری"

(کتھانگر، جوگندر پال، ص نمبر ۵، ۱۹۸۶ء)

افسانچے کی طوالت، اختصار یا اس کی تعریف کے تعلق سے ڈاکٹر عظیم راہی اپنی تحقیقی کتاب "اردو میں افسانچہ کی روایت: تنقیدی مطالعہ" میں لکھتے ہیں:

"افسانچہ ادب کی وہ نثری صنف ہے، جس میں کم سے کم لفظوں میں کم سے کم سطروں میں ایک طویل کہانی کو مکمل کر لیں چونکہ ناول، افسانہ اور افسانچہ کا فرق پہلے ہی اس طرح بتایا گیا ہے کہ ناول پوری زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ جب کہ افسانہ زندگی کے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالتا ہے اور افسانچہ زندگی کے کسی چھوٹے سے لمحے کی تصویر دکھا کر ایک مکمل کہانی قاری کے ذہن میں شروع کر دینے کا نام ہے۔"

(اردو میں افسانچہ کی روایت: تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر عظیم راہی، ص ۵۹، ۲۰۰۹ء)

ڈاکٹر عظیم راہی، خود بھی افسانہ اور افسانچہ نگار ہیں۔ لہٰذا وہ افسانچہ نگاری کے رموز سے واقف ہیں۔ انہوں نے ناول، افسانہ اور افسانچہ کے مابین فرق کو مثالوں سے عمدگی کے ساتھ واضح کیا ہے۔ لیکن افسانچے کے تعلق سے بہت زیادہ اختلافات ہیں۔ خاص کر افسانچے کی ہیئت کو لے کر آج تک کوئی قابل قبول رائے نہیں ملتی۔ معروف افسانہ نگار اور کہنہ مشق افسانچہ نگار محمد بشیر مالیر کوٹلوی نے ادھر فن افسانہ اور فن افسانچہ نگاری پر خاص توجہ صرف کی ہے۔ انہوں نے اس تعلق سے کئی مضامین قلم بند کیے ہیں۔ خود اپنے افسانچوں کے مجموعے "جگنو شہر" کے پیش لفظ "حسب حال" میں انہوں نے افسانچہ کے معیار اور ہیئت پر خاصا زور دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک کامیاب افسانچہ میں اسے ہی مانتا ہوں جسے پڑھ کر محسوس ہو کہ اس افسانچہ کو بنیاد بنا کر ایک طویل افسانہ بھی تخلیق کیا جا سکتا تھا۔ دو جملوں کا افسانچہ میرے نزدیک طویل افسانے کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ قاری کی تشنگی نہیں مٹا سکتا۔ افسانچہ کا موضوع بھرپور چاہتا ہے۔"

(جگنو شہر، محمد بشیر مالیر کوٹلوی، ص ۱۵، ۲۰۱۱ء)

محمد بشیر مالیر کوٹلوی کی بات میں دم ہے کہ افسانچے کو اتنا اور ایسا ہونا چاہیے، جس سے قاری کی تشنگی دور ہو سکے۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ یہ کام دو جملوں کے افسانچے نہیں کر سکتے۔ افسانچہ کھیل تماشا نہیں ہے اور نہ ہی لطیفہ بازی بلکہ افسانچہ کا موضوع بھرپور مواد کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ افسانچے کے خدوخال اور ہیئت کے تعلق سے دو ٹوک لکھتے ہیں:

"دراصل افسانچہ پانچ سے دس سطروں کا ہی (افسانے) کا مقصد پورا کرتا ہے۔ میرے نزدیک دو سطری، سہ سطری افسانچے افسانچے نہیں ہوتے، دو

"میرے چہرے پہ تو جتنا بھی چاہے طنز کر لینا ◆◆ مگر یہ شرط پہلے ہاتھ میں اک آئینہ لے لے"
محمد افسر کاظمی 09431522233 (سہ ماہی "ابجد" ارریہ جولائی تا دسمبر 2013)

سطری افسانچے، افسانے کا نعم البدل نہیں بن سکتے۔ سیاہ حاشیے میں دیکھئے دوسطری زیادہ سے زیادہ دس فیصد ہوں گے لیکن یار لوگوں نے افسانچے کو ایک سطری بنا کر ایک نئی صنف کی بنیاد ڈال دی اور خالق تاریخ ساز بن گئے۔"

(جگنو شہر، محمد بشیر مالیر کوٹلوی، ص ۱۴، ۲۰۱۱ء)

بشیر مالیر کوٹلوی ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے افسانچے کو خون جگر سے سینچا ہے۔ وہ افسانے اور افسانچے کی باریکیوں سے بھی کما حقہ واقف ہیں۔ ان کی نظر فنی لوازم پر بڑی سخت ہوتی ہے۔ وہ افسانوں پر تبصرہ بھی بے لاگ کرتے ہیں۔ انہیں فی زمانہ افسانچے کے ساتھ ہونے والے مذاق سے بہت تکلیف ہے۔ آج ہر ایرا غیرا افسانچے میں طبع آزمائی کر رہا ہے۔ نہ معیار، نہ زبان، نہ کہانی پن..... بھونڈا پن، بے جا اختصار، تجربہ برائے تجربہ.....ادھر افسانچوں کے مجموعے کی باڑھ سی آگئی ہے۔ ہر مجموعے میں ۱۰۰ یا اس کے آس پاس افسانچے موجود ہیں اور یہ زیادہ تر ایک یا دو نشستوں میں تحریر کیے گئے ہیں۔ ایسے افسانچوں سے آج افسانچے کے وجود کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ میں ان سے اتفاق کرتا ہوں کہ افسانچوں کا معیار روز بروز گر رہا ہے۔ افسانچے کی ہیئت کا جہاں تک سوال ہے تو یہ بات قابل توجہ ہے کہ تقریباً ۷۵ سال کے طویل وقفے کے بعد بھی، آج تک افسانچہ، صنف کا درجہ حاصل نہیں کر پایا۔ کیوں؟ کیوں کہ ایک تو ابتدا سے تقریباً ۳۰۔۲۵ برسوں تک اسے مختلف ناموں سے ہی پکارا جاتا رہا۔ افسانچہ نام سا تھ کے دہے میں دیا گیا۔ اس کے بعد بھی کافی زمانے تک افسانچہ، منی افسانہ، مختصر مختصر افسانہ، منی کہانی.....سارے نام متوازی طور پر چلتے رہے۔ دوسرے اس کی ہیئت بھی متعین نہ ہو سکی۔ ویسے نثری فن پاروں کی ہیئت بھی متعین نہیں رہی۔ کیا داستانوں کی طوالت کی کوئی حد مقرر ہے؟ ناولوں کی صفحات کی تعداد متعین ہے؟ طویل افسانہ، طویل مختصر افسانہ یا افسانہ کے صفحات یا سطریں مقرر ہیں؟ جب ایسا نہیں ہے تو پھر افسانچے کو صفحات اور سطروں میں قید کرنا کیا اس صنف کے ساتھ نا انصافی نہیں ہے۔ مغرب میں افسانچوں یا نثری فن پاروں کو ایسی قیود میں قید کیا گیا لیکن ان کے خاطر خواہ نتائج کب سامنے آئے۔ وہاں ۵۵ فکشن (یعنی ۵۵ لفظوں کا فن پارہ) drabble یعنی سو الفاظ پر مشتمل فن پارہ، فلیش فکشن (یعنی سگریٹ کے راکھ ہونے کے ساتھ ختم ہونے والا فکشن) وغیرہ کے تجربے ہوئے لیکن کتنے کامیاب ہوئے؟ پھر افسانچے کے ساتھ ہی ایسا کیوں؟ افسانچے کے چند معروف مصنفین کے افسانچوں پر ایک نظر ڈالیں۔ سعادت حسن منٹو کے سیاہ حاشیے میں ایک سطر، دو سطر، تین، چار پانچ سطروں سے ۶۸ سطروں اور چار پانچ صفحات پر مشتمل افسانچے ملتے ہیں۔

جوگندر پال کے افسانچوں کے مجموعے "کتھا نگر" میں ایک، دو، تین، پانچ سطروں سے لے کر ۲۸۰ سطروں تک کے افسانچے ملتے ہیں۔ محمد بشیر مالیر کوٹلوی کے افسانوی مجموعے "جگنو شہر" میں چار، پانچ، چھ سطروں سے ۴۷، ۴۸، ۶۹ سطروں تک کے افسانچے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر ایم اے حق کے افسانچوں کے مجموعے "نئی صبح" میں تین سطروں سے لے کر ۱۱۵ سطروں تک کے افسانچے ملتے ہیں۔ ان تمام مثالوں سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ افسانچے میں لفظوں، سطروں، صفحوں کی تعداد کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اصل بات کہانی پن، اختصار، تحیر، تجسس کا ہونا ہے جس سے کوئی واقعہ یا لمحہ قید ہو کر کہانی کی شکل اختیار کر لے۔ ناول ہو، افسانہ یا افسانچہ اسی وقت کامیاب ہیں جب اس میں قصہ پن موجود ہو۔ افسانچوں میں اضافی خوبی کے طور پر طنز کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

یوں تو مغرب میں افسانچے کی شروعات بہت قبل ہو چکی تھی، لیکن ہندوستان خصوصاً اردو میں افسانچے تحریر کرنے کا سہرا سعادت حسن منٹو کے سر باندھا جاتا ہے۔ منٹو سے قبل اردو میں افسانچے کا گذر نہیں ملتا۔ منٹو نے "سیاہ حاشیے" کی شکل میں افسانچوں کا ایک ایسا مجموعہ اردو کو عطا کیا جو نہ صرف اپنے عہد کا غماز ہے بلکہ فن افسانچہ نگاری کی اساس بھی ہے۔ منٹو نے جس ہنر مندی اور فنی مہارت سے صنف افسانہ کو استحکام، تقویت اور سربلندی عطا کی اسی فنی مشاقی، بالیدہ نظر اور عصری مسائل سے آگہی کی بدولت افسانچہ جیسی صنف کی بنیاد گذاری کا مشکل امر انجام دیا۔ سعادت حسن منٹو کے مجموعے "سیاہ حاشیے" میں ۱۳۱ر افسانچے شامل ہیں جن میں دو تو ۶۸ اور ۶۵ سطروں یا پانچ صفحات پر مشتمل ہیں اور کئی دو، تین، چار، پانچ سطروں کے بھی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منٹو کے ذہن میں سیاہ حاشیے تحریر کرتے ہوئے یہ واضح نہیں تھا کہ وہ افسانچے تحریر کر رہے ہیں یا یہ بھی کہ منٹو نے افسانچے کے فن یا اس کے فنی لوازم کا کوئی پیمانہ یا معیار نہیں اپنایا تھا۔ یہی سبب ہے کہ محمد حسن عسکری نے سیاہ حاشیے کا مقدمہ "حاشیہ آرائی" لکھتے وقت ان کو کبھی افسانہ کہا تو کبھی لطیفہ بھی۔ محمد حسن عسکری نے اپنے ۱۱ صفحے کے

"سومناتھ کی عظیم قربانی سیکولرزم کی جیتی جاگتی مثال ہے"۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک عجیب سی بے چینی کی لہر سارے مجمع میں دوڑ گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس نے پتھر سے ہوئے ان دو معصوموں کو موٹی سی گالی دی ہو۔" دیپک بدکی 09868271199 افسانہ "اچانک" (افسانوں کا مجموعہ "ادھورے چہرے" صفحہ 122)

مقدمے میں کئی جگہ یوں تحریر کیا ہے:

"منٹو نے بھی فسادات کے
متعلق کچھ لکھا ہے، یعنی یہ
لطیفے یا چھوٹے چھوٹے
افسانے جمع کیے ہیں....."
(سیاہ حاشیے، ص ۱۲)

ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

"فسادات کے متعلق جتنے
بھی افسانے لکھے گئے ہیں
ان میں منٹو کے یہ چھوٹے
لطیفے سب سے زیادہ
ہولناک اور سب سے زیادہ
رجائیت آمیز ہیں" سیاہ
حاشیے، ص ۱۶)

محمد حسن عسکری کے ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ منٹو نا محمد حسن عسکری کے یہاں اور نا اس وقت کے ادبی منظرنامے میں افسانچہ لفظ استعمال ہوا تھا۔ لفظ افسانچہ یا صنف افسانچہ کے طور پر منٹو نے مجموعہ "سیاہ حاشیے" قلم بند نہیں کیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ افسانچہ کے خدوخال کا تعین منٹو کے یہاں نہیں ملتا یا یہ بھی ممکن ہے کہ منٹو کی نظر میں افسانچہ سے مراد وہ قصہ یا واقعہ ہو جسے کم سے کم سطروں میں لکھا جا سکے جس کی کوئی میعاد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ یعنی ہر افسانچہ اپنے موضوع اور Treatment کے اعتبار سے اپنی طوالت یا اختصار کا متقاضی ہوگا۔ سیاہ حاشیے کے سارے افسانچوں کا مطالعہ کر جایئے آپ یہی طریقہ ... موجود پائیں گے۔ دو سطروں پر مبنی افسانچے بھی ہیں۔ مثلاً

آرام کی ضرورت

"مرا نہیں....... دیکھو ابھی
جان باقی ہے،
"رہنے دو یار.......... میں
تھک گیا ہوں۔"

اور تین سطروں کا افسانچہ

الہنا

"دیکھو یار، تم نے بلیک
مارکیٹ کے دام بھی لیے اور
ایسا ردی پٹرول دیا کہ ایک
دکان بھی نہ جلی۔"

جسے اگر ایک سطر میں لکھ دیا جائے تو یہ آج کا یک سطری افسانہ ہی ہوگا۔ یعنی

الہنا

"دیکھو یار، تم نے بلیک مارکیٹ کے دام بھی لیے اور ایسا ردی پٹرول دیا کہ ایک دکان بھی نہ جلی"

اگر منٹو کے ذہن میں یہ واضح ہوتا کہ وہ افسانچہ کی بنیاد ڈال رہے ہیں تو منٹو جیسا ذہین شخص اس طرح کے افسانچے تحریر کرتا جس سے فن افسانچہ نگاری کے نقوش نہ صرف واضح ہو جاتے بلکہ افسانچے کو صنف کا درجہ بھی جلد ہی مل جاتا۔ پھر منٹو الہنا کو تین سطروں میں تحریر نہ کرتا بلکہ ایک سطر میں لکھ کر یک سطری افسانے کا موجد بھی بن جاتا۔

جہاں تک سیاہ حاشیے کے موضوعات کا تعلق ہے تو یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ منٹو نے یہ افسانے/افسانچے، تقسیم ہند کے دلدوز واقعے کے نتائج کے طور پر ملک کے طول و عرض میں پھیلے فرقہ وارانہ فسادات کو موضوع بنا کر تحریر کیے۔ ہر افسانچے میں فرقہ وارانہ کیفیت، اس کے نتائج، انسان کا حیوان بننا، شرمسار ہوتی انسانیت، درندگی، بے رحمی اور سفاکی کے مظاہرے ہیں۔ منٹو یا دیگر فکشن نگاروں میں ایک واضح فرق یہ پایا جاتا ہے کہ منٹو افسانہ قلم بند کرتے وقت جج نہیں ہوتا، وہ کسی کو ظالم، جابر، معصوم، بے گناہ، مظلوم ثابت نہیں کرتا بلکہ صرف تصویر پیش کرتا ہے اور باقی معاملہ قاری کے حوالے کر دیتا ہے۔ قاری خود فیصلہ کرتا ہے کہ کون ظالم ہے، کون مظلوم، کون ظالم ہو کر بھی رحم دل ہے اور کون رہنما ہو کر بھی رہزن۔ کون اپنے سفید کرتے کے اندر کتنا بدنما اور کالا ہے اور کون طوائف ہو کر بھی انسانیت اور محبت کے جذبے سے سرشار ہے۔ محمد حسن عسکری اپنے مقدمے میں منٹو کی اس خوبی کا بیان کرنے سے قبل فساد یا قتل و غارت گری وغیرہ پہ افسانہ لکھنے والوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ لوگ اس مقصد سے
افسانے لکھتے ہیں کہ ظالم کا
خارجی عمل دکھا کر ظلم کے
خلاف نفرت کے جذبات
پیدا کریں۔ لیکن جب تک
ہمیں کسی فعل کا انسانی پس
منظر معلوم نہ ہو، محض خارجی
عمل کا نظارہ ہمارے اندر
کوئی دیرپا، ٹھوس اور گہری
معنویت رکھنے والا ردعمل پیدا
نہیں کر سکتا۔ ہم انسانوں سے
تو نفرت اور محبت کر سکتے
ہیں "ظالموں اور مظلوموں سے
نہیں۔" سیاہ حاشیے، ص ۱۱)

محمد حسن عسکری نے اپنے اس

مقدمے میں تفصیل سے خارجی اور داخلی عوامل کا ایک ادیب کی زندگی اور فن پر اثرات پر بحث کی ہے اور ایسے لکھنے والوں کی خبر بھی لی ہے جو کسی واقعے یا حادثے کی وقوع پذیر ہونے کا انتظار کرتے ہیں اور پھر اس پر شہد کی مکھی کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں۔ فسادات پر بھی سینکڑوں بلکہ ہزاروں ادیبوں نے افسانے قلم بند کیے۔ لیکن ان کے یہ افسانے کیا واقعی افسانے تھے؟ یا پروپیگنڈہ یا خاص بات کا اشتہار؟ یا خود کو صاف ستھرا، سیکولر اور انسانیت کا علم بردار ثابت کرنے کا ذریعہ؟ وہ سیاہ حاشیے کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''فسادات پر لکھنے والے افسانہ نگاروں نے ظلم سے نفرت دلانے کے لیے اکثر یہ طریقہ کار استعمال کیا ہے کہ ظلم ہوتا ہوا دکھا کر پڑھنے والوں کے دلوں میں دہشت پیدا کی جائے مگر سارے واقعات اتنے تازہ ہیں، لوگ اپنی آنکھوں سے اتنا کچھ دیکھ چکے ہیں یا اپنے قریبی دوستوں سے اتنا سن چکے ہیں کہ محض ظلموں کی فہرست اب ان کے اوپر کوئی اثر ہی نہیں کرتی۔ اگر آپ نے اپنے افسانے میں دو چار عورتوں کی بے حرمتی یا بچوں کا قتل دکھا دیا تو اس سے لوگوں کے اعصاب پر کوئی ردعمل ہوتا ہی نہیں۔ یہ زمانہ ہی ایسا غیر معمولی ہے کہ غیر معمولی ظلم آج کل بے انتہا معمولی چیز بن گئے ہیں۔ غیر معمولی باتیں اب لوگوں کو چونکاتی نہیں۔'' (سیاہ حاشیے، ص ۱۲-۱۱)

پروفیسر محمد حسن عسکری نے یہ باتیں اکتوبر ۱۹۴۸ء میں 'سیاہ حاشیے' کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے وقت تحریر کی تھیں یعنی آج سے ۶۶ سال قبل، لیکن ان کے الفاظ سے ایسا مترشح ہو رہا ہے کہ وہ آج کے فسادات کے متعلق اور فسادات پر لکھے جانے والے ادب کے تعلق سے مضمون قلم بند کر رہے ہوں۔ ان تمام باتوں کے برعکس جب وہ فسادات کے تعلق سے منٹو کی تحریروں کا جائزہ پیش کرتے ہیں تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتے ہیں:

''یہ افسانے فسادات کے متعلق نہیں ہیں بلکہ انسانوں کے بارے میں، منٹو کے افسانوں میں آپ انسانوں کو مختلف شکلوں میں دیکھتے رہے ہیں۔ انسان بحیثیت طوائف کے، انسان بحیثیت تماش بین کے وغیرہ وغیرہ، ان افسانوں میں بھی آپ انسان ہی دیکھیں گے فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں انسان کو ظالم یا مظلوم کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور فسادات کے مخصوص حالات میں سماجی مقصد کا تو منٹو نے جھگڑا ہی نہیں پالا۔ اگر تلقین سے آدمی سدھر جایا کرتے تو مسٹر گاندھی کی جان ہی کیوں جاتی۔ منٹو کے افسانوں کے اثرات کے بارے میں نہ زیادہ غلط فہمیاں ہیں نہ انہوں نے ایسی ذمہ داری اپنے سر لی ہے جو ادب پوری کر ہی نہیں سکتا۔'' (سیاہ حاشیے، ص ۱۲)

یہاں عسکری منٹو کی ادب سے کسی وجہ سے وابستگی کی تردید کرتے ہوئے یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ خالصتاً ادب تحریر کرنے پر زور دیتے تھے جب کہ ان کے اکثر معاصرین افسانے، ناول یا دوسرے ادب پارے کو مختلف اور متعدد عینکوں سے دیکھ کر تحریر کرتے تھے اور ان کی بہت ساری وابستگیاں ان کی تحریروں سے واضح ہو جایا کرتی تھیں جب کہ منٹو نے ادیب کی ذمہ داری کو محدود دائرے میں رکھا، وہ کبھی جج نہیں بنتا، وہ کبھی ڈاکٹر یا معالج کا کردار ادا نہیں کرتا، وہ کبھی مصلح نہیں بنتا۔ وہ پہلے فوٹوگرافر کی طرح تصویریں اتارتا ہے پھر ادیب کی طرح ان میں زبان و بیان کے حسب ضرورت رنگ بھرتا ہے اور بس۔ پروفیسر محمد حسن عسکری نے منٹو کے 'سیاہ حاشیے' کے افسانوں/ افسانچوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

''انہوں نے چند واقعات تو ضرور ہوتے دکھائے ہیں مگر

''یہ بات اطمینان بخش ہے کہ آج بھی جنوبی ہند میں اردو زبان اور اس کی تعلیم کی مجموعی صورت حال شمالی ہند سے بہتر نظر آتی ہے۔''
حسن ضیاء، 011-24369189 (اداریہ ''ماہنامہ آجکل'' نئی دہلی مئی 2014)

یہ کہیں نہیں ظاہر ہونے دیا کہ یہ واقعات یا افعال بنفسہ اچھے ہیں یا برے، نہ انہوں نے ظالموں پر لعنت بھیجی ہے نہ مظلوموں پر آنسو بہائے ہیں۔ انہوں نے تو یہ تک فیصلہ نہیں کیا کہ ظالم لوگ برے ہیں یا مظلوم اچھے ہیں...“

محمد حسن عسکری مزید تحریر کرتے ہیں:

”انہوں نے نیک و بد کے سوال ہی کو خارج از بحث قرار دے دیا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر نہ سیاسی ہے نہ عمرانی، نہ اخلاقی بلکہ ادبی اور تخلیقی۔ منٹو نے تو صرف یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ ظالم یا مظلوم کی شخصیت کے مختلف تقاضوں سے ظالمانہ فعل کا کیا تعلق ہے۔ ظلم کرنے کی خواہش کے علاوہ ظالم کے اندر اور کون کون سے میلانات کار فرما ہیں۔ انسانی دماغ میں ظلم کتنی جگہ گھیرتا ہے۔ زندگی کی دوسری دلچسپیاں باقی رہتی ہیں یا نہیں۔ منٹو نے نہ تو رحم کے جذبات بھڑکائے ہیں، نہ غصے کے، نہ نفرت کے، وہ تو آپ کو صرف انسانی دماغ، انسانی کردار اور شخصیت پر ادبی اور تخلیقی انداز سے غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔“

(سیاہ حاشیے، ص ۱۴-۱۳)

پروفیسر محمد حسن عسکری نے ’سیاہ حاشیے‘ کے مقدمے ”حاشیہ آرائی“ میں افسانچوں کو لطیفے بھی لکھا ہے۔ مجھے محمد حسن عسکری کے اس رویے سے سخت اختلاف ہے۔ نہ صرف محمد حسن عسکری بلکہ ان تمام ناقدین اور مبصرین سے مجھے اختلاف ہے جنہیں سیاہ حاشیے کے افسانچے لطیفے نظر آتے ہیں۔ دراصل یہ تو اپنی اپنی نظر کی بات ہے۔ سیاہ حاشیے کے تمام افسانچے کسی نہ کسی طور فرقہ وارانہ فسادات کے موضوع کو Touch کرتے ہیں۔ ان میں انسان کے حیوان بن جانے، اس کی کمینگی، بدکاری، مکاری و عیاری، دوغلہ پن، ذہنی خباثت کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کو پڑھ کر اگر کسی کو ہنسی آجاتی ہے تو یہ اس کا اپنا ذہنی رویہ ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں جو کسی کی پریشانی میں خوش ہوتے ہیں۔ کوئی سڑک پر ٹھوکر کھا کر گر جائے تو تماش بین ہنستے ہیں لیکن کوئی انہیں میں سے اسے اٹھانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں سماج میں شاید پروفیسر عسکری نے اس لیے انہیں لطیفہ کہہ دیا ہوگا کہ اس عہد میں افسانچے کا چلن نہیں تھا نہ اتنی ہی چھوٹی تحریریں سماج میں عام تھیں یعنی ہاتھی جیسی قد آور اصناف سخن کی موجودگی میں چیونٹی جیسی ہیئت کے فن پارے لطیفے ہی لگتے ہوں گے۔ ویسے ان تمام میں لطیفے جیسی کوئی صفت نہیں ہے۔ یہ تو ادب پارے ہیں جو قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ان پر طنز کرتے ہیں، انہیں شرم دلاتے ہیں۔ انہیں ہنسانے کے لیے نہیں ہیں۔ منٹو کے کسی افسانچے پٹھانستان، خبردار، ہمیشہ کی چھٹی، حلال اور جھٹکا، کھاد، استقلال، جوتا، سوری، پیش بندی، رعایت، صدقے اس کے، اشتراکیت، الہنا، آرام کی ضرورت، قسمت...... الغرض ہر افسانچہ قابل مطالعہ ہے اور اپنے اندر طویل کہانیاں لیے ہوئے ہیں۔

رعایت

”میری آنکھوں کے سامنے میری جوان بیٹی کو نہ مارو۔“

”چلو اسی کی مان لو...... کپڑے اتار کر ہانک دو ایک طرف۔“

تقریباً دو سطر (سیاہ حاشیے میں چار سطروں میں ہے) کا یہ افسانچہ قاری کو اندر تک دہلا دیتا ہے۔ ایک جوان بیٹی کے باپ کو رعایت دی جارہی ہے۔ یہاں ظالم موجود نہیں، ظلم موجود ہے۔ ظلم کا نیا طریقہ کار موجود ہے۔ منٹو نے فساد کے کسی ہولناک، منظر کا بیان نہیں کیا ہے۔ لیکن ظلم کی شدت اور اس سے پیدا ہونے والی لہریں خود بخود الفاظ سے قاری کے ذہن و دل تک کا سفر طے کر لیتی ہیں۔ یہاں منٹو کی رعایت لفظی، فنی چابکدستی، موضوع پر گرفت، عنوان کی برجستگی وغیرہ نے مل کر ایک ایسا فن پارہ گھڑا ہے کہ منٹو کے قلم کے جادو کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ لفظوں میں سادگی ہے، سلاست ہے، کوئی سنسنی خیزی نہیں، کوئی فحاشی نہیں، ظلم و زیادتی کے ڈھول نہیں اور نہ ہی قاری کو دہشت زدہ کرنا مقصد ہے۔

”نفس نفس میں ہے یہ کیسی اجنبی آہٹ ☆☆ میں سوچتا ہوں کوئی مجھ میں دوسرا تو نہیں“
ظفر اقبال ظفر 09236692111 (سہ ماہی اسباق جنوری تا مارچ 2014)

افسانچے پر ایک نظر ڈالیں:

سوری

"چھری پیٹ چاک کرتی
ہوئی ناف کے نیچے تک چلی
گئی۔
آزار بند کٹ گیا۔ چھری
مارنے والے کے منہ سے
دفعتہً کلمۂ تاسف نکلا
"چ...چ...چ...چ.........مشکیک
ہوگیا۔"

اس افسانچے میں منٹو کا فن عروج پر ہے۔ فساد کے ماحول میں اپنے فرقوں کا تحفظ اور غیر فرقے پر منصوبہ بند حملہ عام بات ہو جاتی ہے۔ لوگوں کی شناخت مذہب کے اعتبار سے کی جانے لگتی ہے۔ اس افسانچے میں منٹو نے سفاک حقیقت نگاری کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ قتل کے بعد کا افسوس، افسانچے کا ڈرامائی موڑ ہے۔ منٹو نے اس افسانچے میں بہت ہی کم الفاظ میں پوری شدومد کے ساتھ اپنی بات کی ترسیل کی ہے۔ پورے افسانچے میں بس ایک واقعہ ہی درج ہے۔ لیکن یہ واقعہ اپنے اختتام پر قاری کے اندر سرایت کر جاتا ہے اور اپنے ساتھ ان کہے اور نا تحریر کردہ (Unsaid and unwritten) سینکڑوں واقعات جمع کر لیتا ہے۔ قاری مبہوت سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسے بہت دیر تک کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوا؟ افسوس کس کو ہو رہا ہے؟ کس بات کا افسوس؟ کون سی غلطی ہو گئی۔ مشکیک لفظ قاری کو لمحاتی طور پر خالی الذہن کر دیتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب قاری خود کو سنبھالتا ہے تو سوچتا ہے کہ منٹو نے لوہے کی گرم سلاخ اس کے ذہن کے پار کر دی ہے۔ قاتل کا چ چ چ...کرنا منظر کو ایسا زندہ کرتا ہے کہ گویا قاری کے سامنے یہ قتل ہوا ہو۔

سعادت حسن منٹو کے بعد اس صنف کو استحکام و استناد عطا کرنے والے جوگندر پال ہیں بلکہ نام افسانچہ بھی جوگندر پال کا ہی دیا ہوا ہے۔ جوگندر پال اردو کے کہنہ مشق ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے افسانچے کو اپنی کاوشوں سے مضبوط بنیادیں عطا کیں۔ جوگندر پال جب ادب میں داخل ہوئے تو نئی روشنی سے معمور تھے۔ انگریزی کے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ آپ نے غیر ممالک خصوصاً جنوبی افریقہ میں خاصا وقت گذارا۔ ان کے افسانے، ناول اور افسانچے ان کی بالیدہ نظر، نئی فکر اور فن پر مضبوط دسترس کے غماز ہیں۔ جوگندر پال نے افسانچے کو نہ صرف نام دیا بلکہ متعدد تجربات کرتے ہوئے افسانچے کو استحکام بھی بخشا۔ انہوں نے "نہیں رحمن بابو" کے عنوان سے سینکڑوں افسانچے قلم بند کیے۔ انہیں اردو افسانچے کا سعادت حسن منٹو کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ان کے دو افسانچے ملاحظہ کریں:

کچاپن

"بابا، تم بڑے میٹھے
ہو"
"یہی تو میری مشکل ہے
بیٹا۔ ابھی ذرا کچا اور کھٹا ہوتا
تو جھاڑ سے جڑا رہتا"

یہ دو سطر کا افسانچہ اپنے اندر مکمل کہانی لیے ہوئے ہے۔ یہ علامتی افسانچہ ہے۔ میٹھا ہونا، کئی طرف اشارے کر رہا ہے۔ یعنی پھل بہت میٹھا ہے اور جب کوئی پھل زیادہ میٹھا ہوتا ہے تو وہ یا تو خود بخود ٹوٹ کر شاخ سے الگ ہو جاتا ہے یا پھر زمانے کے ذریعہ توڑ لیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس کچے اور کھٹے پھل مضبوطی سے پیڑ سے جڑے ہوتے ہیں۔ اسے نہ صرف پیڑ کے اندرون سے غذا حاصل ہوتی رہتی ہے بلکہ پیڑ کے مالک اور محافظ اس کی خاطر مدارت بھی کرتے رہے ہیں۔ اس کا ہر طرح کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہی معاملہ بزرگوں کا بھی ہے۔ آج کل اولادیں اپنے والدین کو گھر سے نکال دیتی ہیں۔ پورا افسانچہ سماج پر ایک گہرا طنز ہے۔

بے درد

"آخر اس کا درد تھم گیا،
اور درد تھمتے ہی اسے چین آ گیا،
لیکن نہ تھمتا تو بے چارہ مرنے سے بچ جاتا۔"

'بے درد' نام کا یہ افسانچہ جوگندر پال کے عمیق ذہن کی فکری غوطہ زنی ہے۔ افسانچے میں کون بے درد ہے۔ بے درد یعنی ظالم، وہ جس نے اس کے درد کا علاج کر دیا۔ یعنی اسے مار ڈالا، لیکن بظاہر تو وہ اس کا ہمدرد ہے کہ اس سے اس کا درد، دیکھا نہ گیا اور اس نے اسے مار کر ہمیشہ کے لیے درد سے نجات دلا دی۔ قاری یہ طے نہیں کر پاتا ہے کہ اسے درد سے نجات دینے والا اس کا ہمدرد ہے یا بے درد۔ اس میں ایک پہلو اور ہے۔ بے درد، یعنی ایسا شخص جس کے پاس درد نہ ہو۔ یعنی وہ صاحب درد، اب بے درد ہو گیا۔ اسے ہمیشگی کا سکون عطا ہو گیا ہے۔ آپ کسی ایسے مریض کا تصور کریں جو بری طرح زخمی ہو، جس کی سانسیں اکھڑ رہی ہوں۔ دوا کا اثر نہ ہو رہا ہو اور اس کی یہ حالت طوالت اختیار کر گئی ہو۔ پھر کیا ہوتا ہے۔ پھر ہر کوئی اس کے دکھ درد کو دیکھ کر اس کی موت

تقریباً 10 لاکھ کی آبادی پر مشتمل مہاراشٹر کا یہ شہر (مالیگاؤں) اب "اردوستان" کے نام سے پکارا جانا چاہیے۔ یہ مہاراشٹر کے لئے بھی فخر کا مقام ہے کہ اردو زبان و ادب کی آبیاری میں ہندوستان میں سرفہرست ہے۔ "شمیر انصاری 09833999883 (اداریہ ماہنامہ "تحریر نو" نئی ممبئی فروری 2014)

کی تمنا کرتا ہے۔ بے درد ایسے ہی کسی مریض کی حالت کا بہترین ترجمان ہے۔

افسانچے کے فروغ میں جوگندر پال کے ہم عصر افسانہ نگار رتن سنگھ کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ انہوں نے افسانچے کو ایک نیا انداز دیا۔ انہوں نے افسانچوں کے عنوانات قائم نہیں کیے۔ ان کے افسانچوں کا مجموعہ مانک موتی، کے نام سے منظر عام پر آیا اور مجموعے میں عنوان کے بجائے نمبر شمار سے افسانچے درج ہیں۔ ابھی حال ہی میں پنجابی میں ان کے افسانچوں کے مجموعے ''کن من کلیاں'' نے شائع ہو کر خاصی مقبولیت حاصل کی ہے۔ لیکن رتن سنگھ اپنے اس نظریے پر آج بھی قائم ہیں کہ طوالت یا اختصار کے سبب کہانیوں کو خانوں میں تقسیم نہ کیا جائے۔ ان کا ایک مانک موتی ملاحظہ کریں۔

مانک موتی(۳۶)

''ہنستے ناچتے خوشیاں
مناتے ایک ہجوم کو قریب آتا
دیکھ کر ایک بھکارن نے
اپنے تین چار سال کے بچے
کو جلدی سے گود میں اٹھالیا
اور ایسی آڑ میں لے گئی
جہاں سے بچہ ان رنگ
رلیاں منانے والوں کو نہ
دیکھ سکے۔ نا بابانا، وہ بڑ
بڑاتے جارہی تھی۔
''میرے ننگے بھوکے بچے
نے اگر ہنسا سیکھ لیا تو کل کو
اسے بھیک کون دے گا۔''

رتن سنگھ کا یہ افسانچہ نفسیاتی افسانچہ ہے۔ نفسیات کے ساتھ ساتھ معاشیات کا بھی دخل افسانچے کو نیا رخ عطا کرتا ہے۔ ایک غریب بھکارن کا سہارا اس کا گود کا بچہ ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو دیکھ کر لوگ عورت کو جلدی بھیک دے دیتے ہیں اور اگر بچہ روتا دھوتا ہو، بیمار ہو، ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہوں تو زیادہ بھیک ملتی ہے۔ عورت کی اس نفسیات کا افسانچہ عمدگی سے ترجمانی کرتا ہے۔ افسانچہ قاری کو متحیر کر دیتا ہے۔ قاری کبھی عورت پر رحم کھاتا ہے تو کبھی اسے، اس بچے کی زندگی پر رحم آتا ہے اور اسی طرح قاری بہت دیر تک دونوں کے درمیان ہچکولے کھاتا رہتا ہے۔

بشیر مالیر کوٹلوی نے افسانے کے ساتھ ساتھ افسانچے کی بھی خدمت کی ہے اور اپنی منفرد پہچان قائم کی ہے۔ وہ افسانچے میں نپے تلے جملے مرکزی کردار سے وابستہ، قصہ پن، مقصدیت کو اپنے مخصوص انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ ان کی یہ صفت ان کے افسانچوں کو تیز دھاری تلوار جیسا بنا دیتی ہے۔ ان کا ایک افسانچہ ''صلیب سے بڑھ کر'' ملاحظہ کریں:

صلیب سے بڑھ کر

''وہ مسیحا تو نہ تھا مگر دین
دکھیوں کا سچا خدمت گار
تھا۔ اس کو خدمتِ خلق کے
جرم کی سزا، ابن مریم سے
کہیں زیادہ ملی تھی۔
اس غیر ملکی فرشتہ خصلت
انسان پر پٹرول ڈال کر جب
آگ لگائی گئی تو جیپ کے
اندر اس نے اپنے دونوں
بچوں کو جلتے ہوئے دیکھنے کا
کرب بھی جھیلا تھا۔''

بشیر مالیر کوٹلوی نے فنی مہارت سے افسانچے میں پوری داستان کو سمو دیا ہے۔ ایک ایسی درد بھری دستان جس میں سب کچھ موجود ہے۔ ایک خاندان، خاندان کا کھیا، اس کے دو بچے، اس کی پوری زندگی، ایمانداری اور دوسروں کی خدمت کی گواہ۔ نیک شریف، ہر وقت دوسرے کے کام آنے والا شخص.... غیر ملکی سرزمین پر خدمتِ خلق کرنے والا ایک شریف النفس شخص، لیکن اسے اس کی شرافت کا انعام یہ ملا کہ نہ صرف اسے بلکہ اس کے دو معصوم بچوں کو بھی زندہ جلایا گیا اور یہ حرکت کس نے کی، محافظ دستے نے، جس پر حفاظت کا ذمہ ہوتا ہے وہی درندہ بن گیا۔ بشیر مالیر کوٹلوی نے مناسب ترین لفظوں میں ایک دردناک کہانی کو افسانچے کے قالب میں ڈھالنے کا لائق تحسین کام کیا ہے۔

اردو میں ڈاکٹر ایم اے حق واحد ایسے تخلیق کار ہیں جو افسانچہ نگاری کی بنیاد پر ہی مشہور ہیں۔ ایم اے حق صرف اور صرف افسانچہ نگار ہیں۔ شاید وہ اس طرح کے واحد افسانچہ نگار ہیں۔ ورنہ زیادہ تر افسانہ نگار ہی افسانچہ نگار ہیں۔ ایم اے حق نے افسانچہ نگاری میں واقعی اپنی مہارت کے ثبوت پیش کیے ہیں۔ ان کا افسانچوں کا پہلا مجموعہ ''نئی صبح'' کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اب انہوں نے ''موج ادب'' سہ ماہی کے ذریعہ بھی افسانچوں کی اشاعت میں خاصی محنت کی ہے اور رسالے میں افسانچے مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ ان کا ایک افسانچہ ملاحظہ کریں:

مجرم

''میری بیٹی ٹرین کے
ٹائمکیٹ سے واپس آتے ہی
بولی ''پاپا آپ ابھی تک غلط
ہندی لکھتے ہیں۔'' اور میں

''ہماری اپنی خطا جان لے بھی سکتی ہے ◈ سنبھل کے پاؤں رکھو ہر قدم پہ دلدل ہے''
علیم طاہر 09323177531 (ششماہی ''احساس'' مالیگاؤں، جون 2013)

دوہری شرم سے گڑ گیا۔"

دو سطروں میں ایک پوری کہانی از شروع تا آخر انگڑائی لے رہی ہے۔ چھوٹی سی کہانی اپنے اندر کتنے Dimension رکھتی ہے۔ افسانچہ نگار نے ٹرین کے باتھ روم کی دیواروں پر فحش جملے لکھنے اور تصاویر بنانے والوں کو بے نقاب کیا ہے۔ ہم سب کا آئے دن ایسے جملوں اور تصاویر سے واسطہ پڑتا ہے لیکن ہم اس کے تدارک کے لیے کچھ نہیں کر پاتے سوائے اس کے لکھنے والوں کو بھی زبان سے کبھی دل کے اندر دو چار صلواتیں سنا کر خود کی ذمہ داری سے سبک دوش ہو جاتے ہیں۔ مگر "مجرم" افسانچہ ایسے حضرات کو ایسی شرم دلاتا ہے کہ اگر واقعی ان کے اندر کچھ رواداری، اقدار اور شرم باقی ہو تو انہیں ڈوب مرنا چاہیے۔ لفظ "دوہری" افسانچے کے اثر کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔

افسانچے کی روایت کو استحکام بخشنے والوں میں اورنگ آباد کے عارف خورشید کا نام خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ عارف خورشید کے افسانچوں کا مجموعہ "یادوں کے سائے" ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آیا۔ ان کی باریک بین نگاہ افسانچے میں نئے تیور پیدا کرتی ہے۔ وہ عورت مرد کے مابین رشتوں کو بڑی فن کاری سے افسانچے میں پیش کرتے ہیں:

سوالیہ نشان

"جنت میں غلطی کی سزا..... دنیا
"دنیا میں غلطی کی سزا......؟
شوہر دبئی میں خود
ہندوستان میں،
دونوں اپنی اپنی آگ میں"

سوالیہ نشان قاری کے ذہن کو جھنجوڑتے ہوئے بے شمار سوال داغ دیتا ہے۔ قاری کا ذہن سوالات کے گھیرے میں آ جاتا ہے۔ افسانچہ اپنے آپ میں پورے ناول کی کہانی سموئے ہوئے ہے۔ جنت سے آدم کے نکالے جانے کے واقعے سے موجودہ عہد کے سلگتے ہوئے روزگار اور جنسی مسائل کو فنی کاوش سے قصے میں پرو دیتا ہے۔ افسانچے میں مرد کی دنیا بھی آباد ہے اور عورت کا جہاں بھی۔ دونوں ایک دوسرے کی فرقت کا شکار بھی ہیں اور اپنی اپنی دنیاؤں میں خوش بھی۔ ہر دو طرف اپنی اپنی آگ سلامت ہے۔ یہ آج کے دور کے نفسا نفسی کے ماحول کی خوبصورت عکاسی ہے۔

عظیم راہی نے افسانچہ نگاری کے دو طرفہ فروغ میں تعاون دیا ہے۔ انہوں نے نہ صرف عمدہ افسانچہ نگاری کی ہے بلکہ انہوں نے افسانچہ نگاری کی تنقیدی روایت کو بھی بنیاد فراہم کرنے کا اہم کام کیا ہے۔ انہوں نے اردو میں افسانچہ کی روایت، تنقیدی مطالعہ کتاب لکھ کر افسانچہ نگاری کی تنقید میں میل کا پتھر ثبت کیا ہے۔ ان کی یہ کتاب ۲۰۰۹ء میں منظر عام پر آئی ہے اور اس کتاب کی اشاعت کے بعد افسانچہ نگاری کی مقبولیت میں روز افزوں فروغ حاصل ہوا ہے۔ افسانچہ لکھنے، افسانچے پر تنقید اور افسانچے کے فروغ کے لیے عملی کاوشوں کو ایک نئی سمت ملی ہے۔ عظیم راہی کا ایک افسانچہ ملاحظہ ہو:

چلن

"وہ شخص، جس نے میرے
قتل کی سازش رچی تھی
معجزاتی طور پر...... میرے
بچ جانے پر........
مبارک باد دینے والوں میں
وہی سب سے آگے تھا۔"

عظیم راہی نے "چلن" میں سماج کے منافقانہ رویے کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ یہ افسانچہ سفید کالر اور سیاہ دل لوگوں، ڈھونگی مذہبی رہنماؤں، دوغلی شخصیت کے مالک افراد کی زندگی پر کاری ضرب ہے۔ آج زمانہ اس طرح کا ہو گیا ہے۔ سیاسی لوگ پہلے کسی کیس میں پھنساتے ہیں اور بعد میں ہمدردی جتانے پہنچ جاتے ہیں۔

نذیر فتح پوری اردو کے زود نویس ادیب و شاعر ہیں۔ انہوں نے ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ افسانچہ نگاری میں بھی وہ کامیاب ہیں۔ ان کے افسانچوں کا مجموعہ "ریزہ ریزہ دل" بہت پہلے شائع ہو چکا ہے۔ ان کا ایک افسانچہ ملاحظہ کریں:

ترقی

"آدمی نے کمپیوٹر بنایا اور
کمپیوٹر بننے کے بعد آدمی خود
بگڑ گیا۔ کمپیوٹر کی خرابی آدمی
دور کر سکتا ہے۔ لیکن آدمی
کے بگاڑ کا علاج؟؟؟

تین سطروں کا افسانچہ 'ترقی' موجودہ عہد کی کامیاب ترجمانی کرتا ہے۔ آج کا عہد IT کا عہد ہے۔ اس IT کے عہد میں ہر طرف کمپیوٹر ہی کمپیوٹر ہے۔ ہر کام کمپیوٹر کر رہا ہے۔ Internet نے آج انسان کو ہر طرح کی سہولتیں مہیا کرا دی ہیں۔ آج انسان کے پاس رشتوں ناطوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ وہ کمپیوٹر کی طرح اسکرین اور ماؤس ہو گیا ہے۔ انسان میں آنے والے اس بگاڑ کا کیا علاج ہے۔ Porn sites, social sites نے واقعی آج کے انسان کو کردار کی سطح پر خاصا بگاڑ دیا ہے۔ انسان کے اندر ایسی خرابی پیدا ہو چکی ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ یہ انسانی

"جس وقت بیٹے کو ماں باپ کی ضرورت تھی، ماں باپ بیٹے سے دور رہے، اور جب ماں باپ کو بیٹے کی ضرورت تھی بیٹا ماں باپ سے دور ہو گیا"
یٰسین احمد 09848642909 (افسانوں کا مجموعہ "سایوں بھرا دالان" (سہ ماہی اسباق، پونے جنوری تا مارچ 2014)

ترقی ہے یا؟ افسانچہ ایک سوالیہ نشان چھوڑ کر قاری کو بے چین کر جاتا ہے۔

میں نے یہاں چند افسانچوں کے تجزیے اپنے طور پر کیے ہیں۔ آج افسانچہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن یہاں مقصد فہرست سازی نہیں ہے۔ سینکڑوں افسانچہ نگار آج مستعدی سے افسانچے لکھ رہے ہیں۔ پچاس سے زائد افسانچوں کے مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ یہاں میں نے اپنی پسند سے چند افسانچے پیش کیے ہیں۔ ان افسانچوں کے انتخاب میں، میں نے ایک خاص خیال رکھا ہے۔ کہ یہ سب کے سب دو تین یا چار سطروں کے افسانچے ہیں اور سب کے سب اپنے اندر طویل کہانی کا لاوا لیے ہوئے قطرے میں سمندر کی مثال ہیں۔ افسانچہ اسی طرح اپنے قارئین کو موضوع کے تیکھے پن، اختصار، زبان کی چابکدستی اور غیر متوقع اختتام سے سحرزدہ کر دیتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب قطعی نہیں کہ ان سے کچھ طویل یا دو تین صفحات کے افسانچے یہ کام بخوبی نہیں کر پاتے ہیں۔ وقت کی کمی کے باعث میں نے قدرے مختصر افسانچے اپنے مطالعے میں شامل کیے ہیں بعد میں ہر طرح کی افسانچے کا مطالعہ پیش کرنے کا ارادہ ہے۔

افسانچے کے فروغ
میں رسائل واخبارات کا کردار

افسانچے کے فروغ میں رسالوں اور میگزین کا بہت اہم کردار رہا ہے اور اس سلسلے میں شمع کے کردار سے کسی طور انکار ممکن نہیں۔ شمع نے افسانچوں کو ہمیشہ اپنے صفحات پر جگہ دی۔ کبھی ایک صفحے کے افسانچے "اسی صفحے پر مکمل" کے Tag کے ساتھ اور کبھی مختصر مختصر اور کبھی منی کہانی کے لیبل کے ساتھ افسانچوں کو تصاویر سے مزین، دیدہ زیب بنا کر شائع کرنا۔ شمع کے افسانچوں نے افسانچے کے فروغ میں خاصا اہم کردار ادا کیا ہے۔

شمع کے ساتھ ساتھ اردو میں کئی فلمی میگزین اور رسالے شائع ہوئے ان میں روبی، فلمی ستارے، گلفام، فلم ویکلی وغیرہ رسائل نے بھی افسانچوں کی اشاعت میں مستقل حصہ لیا۔ یہی نہیں اردو روز نامہ، اخبارات کے اتوار کے ضمیمے بھی افسانچوں سے مزین ہوتے تھے۔ اخبار مشرق، آزاد ہند، اقرا، انقلاب، راشٹریہ سہارا، عظیم آباد ایکسپریس، سنگم، فاروقی تنظیم، قومی تنظیم، سیاست، ہند سماچار، تیج، پرتاپ، ملاپ، اردو ٹائمز، آگ، صحافت، سالار، جیسے اہم اردو روزناموں میں افسانچوں کی مسلسل اشاعت ہوتی رہی ہے ہفت روزہ اخباروں میں بھی افسانچے شائع ہوتے رہے ہیں۔

ادبی رسائل میں 'شاعر' نے افسانچے کے فروغ میں خاصا اہم کردار ادا کیا ہے۔ شاعر نے افسانچہ نمبر، افسانچے پر خاص شمارے، افسانچہ نگاروں کے گوشے وغیرہ شائع کر کے اپنا ایک الگ مقام بنا لیا ہے۔ اسی طرح آجکل، اسباق، رنگ، رہنمائے تعلیم، پاسبان، پرواز ادب، چنگاری، موج ادب، روشن ادب، روشن چراغ، گونج وغیرہ رسائل نے اپنے افسانچے شائع کر کے اس کے فروغ میں حصہ لیا۔

آخر میں، یہی کہنا چاہتا ہوں کہ ان افسانچوں کو پڑھیں، ان میں سے دو ایک بھی آپ کو پسند آ جاتے ہیں تو میں خود کو کامیاب سمجھوں گا۔ ورنہ یہ میری ذاتی دنیا ہے جو میرے جنون سے قائم ہے اور اس طرح آئندہ بھی قائم رہے گی جس پر پسند و ناپسند سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

❀❀❀

اردو گیت

ڈاکٹر فراز حامدی
09166779318

ساجن تم نے وچن دیا ہے، پریت تو بات نبھارے گی

گھڑی گھڑی جب من دھڑکے گا، آس تو بانہہ پسارے گی

بھور بھئے، یا کڑی دھوپ ہو، سانجھ کی بیلا ہو یا رین

کوئی دِشا سے آؤ ساجن، چاروں اور بچھے ہیں نین

وہ گھڑی کا انت تو ہوگا، کبھی تو بیرن ہارے گی

ساجن تم نے وچن دیا ہے، پریت تو بات نبھارے گی

جانے کب پاس آؤ گے، کب پیاس بجھے گی آنکھوں کی

سنگ تمہارے مسکاؤں گی تا کہ جھکے گی سکھیوں کی

جانے کب سچ ہو کے کلپنا، من کا بوجھ اتارے گی

ساجن تم نے وچن دیا ہے، پریت تو بات نبھارے گی

آنسو آنسو آنچل بھیگا، ساون آگ لگائے رے

کیسے بھولوں نام تمہارا، ہر رت یاد ستائے رے

لاج سے ہونٹ نہ کھل پائے تو دھڑکن تمہیں پکارے گی

ساجن تم نے وچن دیا ہے، پریت تو بات نبھارے گی

❀❀❀

"میں تو سمجھا تھا کہ سب ٹوٹ چکے ہیں رشتے ❀ میرے ماضی نے مگر آج صدا دی مجھ کو"
ساجد داؤ نگری 09868706845 (مجموعہ "پیاس کا سمندر" صفحہ 80)

منی کہانی

حجاب

ڈاکٹر بلند اقبال (کناڈا)

حجاب ہی تو تھا پل بھر میں نورین کے سر سے اُڑا اور میرین کے نیم برہنہ بدن پر آ گرا، مگر لمحے بھر میں صدیوں کا سفر طے کر کے اُسے گوتم کے آشرم میں یشودھرہ کے روبرو لا کھڑا کیا۔۔

وہی جولائی کی تمتماتی ہوئی دھوپ بھری سہ پہر تھی اور میرین کا دمکتا ہوا کندنی بدن تھا، وہی سورج کی چمکتی ہوئی ست رنگی کرنیں تھیں اور میرین کے سنہرے مساموں میں ناچتے ہوئے پسینے کے نمکین قطرے تھے۔ وہی میامی کے ساحلوں کی گرما گرم ریت تھی اور یخ سمندری لہروں کا میرین کے جسم کے آوارہ زاویوں سے ملاپ کا ارمان تھا۔ بند پلکوں تلے جھیل جیسی نیلی آنکھوں میں ساری عمر کے خواب لیے میرین کہنے کو دنیا و مافیا سے بے خبر اپنے عاشق جارج کے ساتھ چپ چاپ لیٹی ہوئی تھی مگر اندر ہی اندر جارج کے دل میں خود کو ٹٹول بھی رہی تھی۔ وہ کبھی کروٹ بدل کر اپنے بدن کے ترچھے زاویوں میں جارج کی نظروں کو گرفتار کرنے کی کوشش کر رہی تھی تو کبھی مسکرا کر اپنے چہرے کے حسین نقوش سے اُس کی نگاہوں کو دوچار کر رہی تھی۔

میرین کی ہر ایک غیر ارادی حرکت میں بس ایک ہی خواہش انگڑائی لے رہی تھی کہ جارج کے دل کی دھڑکنوں میں اُس کے ہی نام کا ساز بجتا رہے۔ اُس کی ہر ایک ارادی ادا میں بس یہی ایک ارمان سانس لے رہا تھا کہ جارج کی نگاہوں میں صرف اُس کا ہی منظر چلتا رہے۔ کبھی کبھار جو وہ ڈرتے ڈرتے پلکیں اُٹھا کر اپنے اردگرد پھیلے ہوئے حسین جسموں کے نظارے دیکھتی تو یک لخت اُس کا دل چاہتا کہ اپنی دونوں ہتھیلیوں سے جارج کی آنکھوں کو اس طرح سے ڈھانپ دے کہ انگلیوں کے جھروکوں سے اُسے صرف میرین کا ہی سراپا نظر آئے مگر اچانک اُس کی ہتھیلیاں جارج کی آنکھوں کو ڈھانکنے کے بجائے نورین کے سر سے اُڑ کر اس کے بدن پر گرنے والے ریشمی حجاب سے ٹکرائی اور وہ پلکیں جھپکا کر دور کھڑی ہوئی حیران و پریشان نورین کو دیکھنے لگی۔۔

سانولی سلونی سی نورین کا بیاہ ابھی کچھ روز قبل ہی تو خوبرو اور خوش قامت محمد وجیہ کے ساتھ کراچی میں ہوا تھا اُس وقت تو نورین کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اُس جیسی پر اعتماد ماڈرن لڑکی میامی پہنچ کر اپنے چہرے کو یوں حجاب سے ڈھک دے گی مگر جونہی اُس کی نظریں اپنے چاروں جانب موجود پرکشش عورتوں کے ہجوم پر پڑی تو اُس نے ڈرتے ڈرتے محمد وجیہ کی بھٹکتی ہوئی نظروں کو دیکھنا شروع کیا اور جب اُن حسین عورتوں کی نظروں کے تیروں اور وجیہ کے کمزور دل کے درمیان حائل ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اپنے دل کو زخمی ہونے سے بچانے کے خاطر کسی ایسے حجاب کو بے چینی سے ڈھونڈنے لگی جو وجیہ کے دل کو مظبوط اور نگاہوں کو صرف اُس کی طرف رکھ سکے۔ بالآخر ایک دن اُس نے خود اپنے ہی سر اور بدن پر ایک ریشمی اسکارف لپیٹ لیا اور محمدؐ کے حجاب سے وجیہ کی بھٹکتی نظروں کو ڈھانپ دیا مگر آج جب وہ اپنے وجیہ کے ساتھ میامی کے ساحل پر حجاب لیے بلا خوف و خطر گھوم رہی تھی تو اچانک ہوا کے کسی آوارہ جھونکے نے اس کے پیارے حجاب کو اُڑا دیا اور وہ کسی کٹی ہوئی پتنگ کی طرح اُڑتا ہوا ساحل پر آڑی ترچھی سی لیٹی ہوئی میرین کی نیم خوابیدہ آنکھوں سے ہوتا ہوا اس کے نیم برہنہ جسم پر پھیل گیا۔۔

میرین نے پلکیں جھپکائیں اور حجاب کو آنکھوں پر سے ہٹائے بغیر ہی دور کھڑی ہوئی نورین پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر حجاب کے آڑے قریب ہی لیٹے ہوئے اپنے عاشق جارج کو ایک بار پھر تکنے لگی جس کی بھٹکتی ہوئی نظروں میں ساحل کی ریت کو دہکاتے ہوئے گیلے مگر گرم برہنہ بدن تھے۔

میرین نے دھیمے سے آنکھیں بند کی اور کچھ دیر کے لیے نورین کے حجاب کو دھڑکتے دل کے ساتھ خود میں اُتارنے لگی۔۔

آہستہ آہستہ حجاب کے رنگ بکھرنے لگے اور پھر وہ سب ہی رنگوں سے عاری ہو کر اُس کے بدن سے سرکتا ہوا اُس کی روح میں شامل ہو گیا اور پھر صدیوں کا سفر لمحے بھر میں طے کر کے یشودھرہ کے من میں اُتر گیا۔ میرین کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں اور پھر اُس نے دیکھا جیسے گوتم بدھا کی صورت آشرم میں نمودار ہوئے اور میرین کو لگا جیسے ایک سورج آشرم میں طلوع ہو رہا ہے۔ یشودھرہ ایک طرف کٹی ہوئی اپنی مٹھی میں سندور لیے گوتم کو نمکین آنکھوں سے تک رہی تھی مگر گوتم کی آنکھیں بھگوان کو خود میں سمانے کے لیے بھٹک رہی تھی۔ یشودھرہ اپنی تمام تر سندرتا لیے اپنی ہتھیلیوں کے آنگن میں کسی دعا کی صورت گوتم کا انتظار کر رہی تھی مگر گوتم اپنی آنکھوں میں بھگوان کو بجائے پیپل کے جھاڑ تلے آواگون کے ارمان لیے یشودھرہ سے منہ پھیرے یاترہ میں گم تھے۔ یشودھرہ کبھی تو ڈبڈباتی آنکھوں میں التجا لیے اپنے آنچل میں خود کو چھپا لیتی تو کبھی مسکرا کر گوتم کو اپنے لیے مائل کرتی مگر گوتم بدھا کا روپ لیے بھگوان کے ساتھ حجاب میں تھے۔۔

کچھ دیر بعد جب سورج اپنی کرنوں سے سارے آشرم کو نہلانے لگا تو یشودھرہ نے خود کو بھگوان کے روبرو پایا اور پھر یکلخت گوتم کی آنکھوں سے حجاب کو سمیٹ کر خود کو بھی اُن کے آشرم کے سپرد کر دیا اور یوں اپنے گوتم کو پھر سے پا لیا۔۔

میرین نے پلکیں جھپکائی اور پھر دھیمے سے نورین کے ریشمی حجاب کو اپنی خوابیدہ آنکھوں پر سے سرکایا تو اُسے لمحے بھر کے لیے دور کھڑی ہوئی نورین میں یشودھرہ کی جھلک دکھائی دی۔ اُس نے کروٹ بدل کر اپنے نیم برہنہ بدن کو سمیٹا اور پھر کسی حجاب کی صورت اُن میں جارج کی بھٹکتی آنکھوں کو چھپا دیا۔

❀❀❀

"1936 میں ترقی پسند تحریک کے تخم نے انگڑائی لے کر اپنے وجود کا اعلان کیا۔ افسانے کو عروج حاصل ہوا 1936 سے 1955 تک کے زمانے کو اردو افسانے کا عہد زریں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا"

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری 09456259858 مضمون "اکیسویں صدی کا افسانوی منظر نامہ: ایک جائزہ" (سہ ماہی "فکر و تحقیق" نئی دہلی، اکتوبر تا دسمبر 2013)

مشرف عالم ذوقی بحیثیت نقاد

محمد نظام الدین
ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی
('آب روان کبیر' کے حوالے سے)

یوں تو ادبی حلقوں میں مشرف عالم ذوقی کی شناخت ایک سرکردہ فکشن نگار کی ہے۔ جس پر انہیں مکمل دسترس حاصل ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ذوقی کو دیگر اصناف پر بھی عبور حاصل ہے۔اب تک ادبی دنیا میں یہ بات بازگشت کر رہی تھی کہ ذوقی کا بنیادی محور اور مرکز اردو فکشن نگاری ہے۔ مگر جب حالیہ دنوں میں ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ شائع ہو کر منظر عام پر آیا تو ادبی دنیا میں اس کی کافی پذیرائی ہوئی۔ اور اردو ادب کے بہی خواہ اور باذوق حضرات نے ذوقی کے تنقیدی مضامین کو اردو ادب کے بحر ذخار میں ایک اضافہ قرار دیا۔

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جب ایک کہنہ مشق تخلیق کار تنقید کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو اس کی تنقید میں کافی پختگی اور قوت گویائی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسی پر خار وادی سے گزر کر تنقید کے مقام تک پہنچتا ہے، جہاں اب اس کے لیے کوئی چیز اجنبی نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ وہ ہر راہ، ہر گوشہ اور ہر منزل سے آشنا ہوتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی پہلے تخلیق کار ہیں بعد میں تنقید نگار۔ تخلیق کے میدان میں اپنی صلاحیت کا لوہا منوانے کے بعد تنقید کی دنیا میں جست لگائی ہے۔ اور اردو ادب میں آئے دن جنم لے رہی تحریکات، میلانات اور نظریات پر کھل کر اپنی رائے پیش کی ہے۔ ایک تخلیق کار کے لیے صرف لکھنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے اپنے نظریات کا اظہار بھی ضروری ہے۔ تاکہ قارئین اس کے نظریات سے بھی بخوبی واقف ہو سکیں۔ اس سلسلے میں ذوقی نے خود لکھا ہے:

"صاحب، میں نقاد نہیں اور نہ ہی مکتب تنقید کے بنیادی نکتوں سے آگاہ۔ لکھنا شروع کیا تو اس بات کی بھی آگاہی ہوئی کہ صرف لکھنا ہی کافی نہیں ہے۔ آپ کے نظریات کی بھی قارئین تک رسائی ہونی چاہیے۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا... تخلیق کے ساتھ ساتھ مضامین قلمبند کرنے کا۔"

(آب روان کبیر، ص۔10)

'آب روان کبیر' ذوقی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں وہ تمام مضامین شامل ہیں جو 2000ء کے بعد سے اب تک وہ لکھتے رہے ہیں۔ 'آب روان کبیر' میں کل 28 تنقیدی مضامین زینت قرطاس بنے ہیں۔ حالانکہ ذوقی نے اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے اپنے تخلیقی سفر کے دوران 400 سے زائد مضامین لکھے ہیں۔ لیکن ان میں سے کچھ کھو گئے تو کچھ نسیان کا شکار ہو گئے۔ ذوقی کی زبانی ملاحظہ ہو:

"میرا نقطہ نظر واضح تھا کہ میں رموز کائنات اور اسرار افسانہ کو سمجھنے کی مہم پر نکلا ہوا ایک ادنی سا مسافر ہوں۔ اس دوران کوئی 400 سے زائد مضامین لکھے ہوں گے۔ کئی بھولے بسرے رسائل میں کھو گئے اور جو کچھ پاس ہیں انہیں الگ الگ موضوعات کے تحت کتابی شکل میں لانے کا ارادہ ہے۔ میں نے اردو فکشن اور اردو ناول کے حوالہ سے بہت کچھ لکھا ہے۔ 'آب روان کبیر' میں زیادہ تر مضامین افسانے کے سلسلے میں ہیں۔ اس کے بعد جلد ہی ناول پر تحریر کردہ مضامین کی کتاب آئے گی۔ یہ کتاب بھی تیار ہے۔"

('آب روان کبیر' ص، 11-10)

ادب میں جب کوئی تحریک یا رجحان اپنا رول ادا کر کے ماند پڑ جاتا ہے تو اس کے فوراً بعد ادب میں نمایاں تبدیلی آتی ہے۔ اور ادب میں تبدیلی کا ہونا برحق اور درست ہے۔ اور ادب کا قافلہ اسی طرح آگے بڑھتا ہے۔ دنیا کو اب جبکہ نئے درپیش مسائل اور تبدیلیوں کا سامنا ہے۔ اور گلابلائزیشن کے اس دور میں ایک نیا معاشرہ اور ایک نئی تہذیب ابھر کر سامنے آئی ہے تو اس پس منظر میں ادب میں بھی واضح تبدیلی اور نئی سوچ دستک دے چکی ہے۔ اس سلسلے میں ذوقی کا خیال ہے کہ موجودہ دور میں موضوعات

بے شمار ہیں لیکن لکھنے والوں کی تعداد کم ہے۔ ان دنوں ادب بے سمت ہے اور لکھنے والے خاموش:

"سن 2012 کے ختم ہونے تک اردو ادب تحریکوں سے باہر نکل کر ایک ایسی بھول بھلیاں کا شکار ہے جہاں راستہ گم ہے۔ تہذیبوں کا تصادم جاری ہے۔ ایک مردہ زبان کو زندہ رکھنے کی کوشش اور ہندوستانی لکھاڑیوں کا حال یہ کہ مشکل سے بھی کبھی سال دو سال پانچ سال میں کوئی ایک کہانی سامنے آجاتی ہے.... اردو ادب کی صحیح صورتحال کا جائزہ لیجیے تو اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان دنوں ادب بے سمت ہے اور لکھنے والے خاموش۔" ('آب رواں کبیر' ص۔ 17-16)

اردو افسانے کی ابتدا سے ہی ایک بحث کا آغاز ہوا کہ اردو کا پہلا افسانہ کون ہے؟ بعض نقادوں نے پریم چند کو پہلا کہانی کار مانا تو بعض نے سرسید کو۔ اس تعلق سے ذوقی نے اپنی بے باک رائے کا اظہار کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"اردو فکشن کی تنقید لکھنے والوں کا ایک بڑا طبقہ 'گزرا ہوا زمانہ' کو سرے سے کہانی ہی تسلیم نہیں کرتا۔ میرے خیال میں اسے اردو کی پہلی کہانی نہ ماننا سرسید کے ساتھ زیادتی ہے۔ 'گزرا ہوا زمانہ' میں وہ سب کچھ ہے۔ جس کی ایک خوبصورت، معیاری اور بلند پایہ افسانے سے امید کی جا سکتی ہے۔"

('آب رواں کبیر' ص۔30)

1980 کے بعد اردو افسانہ ایک نیا موڑ لیتا ہے۔ اور اس عہد میں بیانیہ کی واپسی ہوتی ہے۔ اور نئے لکھنے والوں کے سامنے موضوعات کا انبار ہوتا ہے۔ لیکن اسی دور میں یہ بھی شکایت ہوئی کہ قاری گم ہے۔ حالانکہ ادب کو پہنچنے کے لیے تخلیق، تنقید اور قاری کا ہونا ازبس ضروری ہے۔ ذوقی رقمطراز ہیں:

"80 کے بعد لکھنے والوں کے سامنے گزرے ہوئے 80 سال کے تجربے تھے۔ اتنے بڑے کینوس کو سامنے رکھ کر اپنی جگہ کا تعین کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یہ وہی عہد تھا، جب زمین سے وابستہ ہونے کا مسئلہ بھی اٹھا۔ بیانیہ کی واپسی ہوئی۔ اجودھیا اور ملک میں ہونے والے فسادات نے نئے سیاسی پس منظر کا موضوع دے دیا تھا۔" ('آب رواں کبیر' ص۔41)

ذوقی کے تنقیدی مضامین کے مطالعہ کے بعد ایک نظریہ کھل کر سامنے آتا ہے کہ وہ ادب میں صحت مند اختلاف کے قائل ہیں۔ اختلاف کی صورت میں ادب کا دائرہ وسیع ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور ادب کا کارواں صحت مند تنقید اور غیر جانبداری تنقید کی بدولت آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اس بارے میں ذوقی کا نظریہ یہ ہے:

"ادب میں زندہ رہنے کے لیے صحت مند اختلاف ضروری ہے۔ لیکن عام طور پر اردو زبان میں جب بھی ادب کے لیے نئے تجربوں کو بننے کا موقع دیا گیا ہے اختلاف بھی کھل کر سامنے آئے ہیں۔ دنیا میں شاید ہی کوئی زبان ایسی ہو، جہاں اختلاف کی ٹھنڈی، صحت مند اور خوشگوار ہواؤں کا چلن نہ ہو۔" ('آب رواں کبیر' ص۔45)

1980 کے بعد نئے لکھنے والوں اور نقادوں کے درمیان تناؤ کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ نئے لکھنے والوں نے نقادوں کی آراء اور فیصلہ کی پرواہ کیے

"شیخاواٹی کا یہ ریگستان ہمیشہ میرے ذہن میں زندہ رہا۔ پونے سے جب بھی سال دو سال میں فتح پور جاتا ہوں تو کسی نہ کسی بہانے کچھ گھنٹوں کے لئے ریت کے ٹیلوں میں جا کر اپنا ماضی تلاش کرتا ہوں۔"
نذیر فتح پوری 09822516338 "بیتے کل کا ایک ایک پل" (سہ ماہی "رنگ" دھنباد اپریل تا جون 2014)

بغیر اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا۔ اوران میں سے کچھ ایسے بھی تھے۔ جنھوں نے تنقید کا بھی مورچہ سنبھال لیا۔ کیونکہ وہ بھی صرف لکھنے پر ہی اکتفا کرنا نہیں کر چاہتے تھے بلکہ سماج اور معاشرہ کا ایک مضبوط حصہ بھی بننا چاہتے تھے۔ اس تعلق سے ذوقی نے اپنی تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے کہا ہے:

> ''لیکن جلد ہی افسانہ نگاروں کو اس بات کا بھی احساس ہو گیا کہ اچھا لکھنے کے لیے نقاد کو ریجکٹ کرنا کوئی ضروری نہیں ہے۔ ایسا سوچنے والوں کی ایک بڑی جماعت تھی۔ نتیجے کے طور پر 80 کے بعد کے افسانہ نگار نے تنقید کا مورچہ سنبھال لیا۔ ایک حقیقت اور بھی تھی تنقید کا سہارا لے کر وہ سماج، معاشرہ اور سیاست پر اپنے خیالات کا کھلا اظہار چاہتا تھا اور مضامین ہی یہ زمین فراہم کر سکتے تھے۔ وہ صرف کہانیاں اور ناول لکھ کر مطمئن نہیں ہو سکتا تھا بلکہ وہ اس معاشرہ اور سیاست کا ایک مضبوط حصہ بننا چاہتا تھا۔ (آب روان کبیر، ص۔ 44-45)

موجودہ دور میں جس طرح کی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ اس سے نقاد خوش نہیں ہیں۔ ان کے تنقیدی معیار پر یہ کہانیاں کھری نہیں اتر رہی ہیں۔ ان کو شکایت ہے کہ آج کی کہانیوں میں وژن، سوچ اور فکر کی کمی ہے۔ لیکن اس بات سے ذوقی نے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ 2010 تک آتے آتے اردو افسانہ نگاروں کی ایک بڑی جماعت اچھے افسانے اور کہانیاں لکھنے لگی ہیں:

> ''سن 2010 تک آتے آتے اردو افسانے کی دنیا میں کئی اچھے نام شامل ہو چکے ہیں۔ خوشخبری یہ ہے کہ ایک بار پھر نئی نسل اچھی کہانیوں کے ساتھ اردو افسانے کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ یہ وقت مایوسی اور تاریکی سے باہر نکل کر ان افسانوں کی شناخت کا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ خالد جاوید، سید محمد اشرف، صدیق عالم، رضوان الحق، شائستہ فاخری، رحمٰن عباس، صغیر احمد جیسے افسانہ نگاروں پر بھی گفتگو کے دروازے کھلیں۔ ('آب روان کبیر' ص۔ 47)

1960 سے 1980 تک جو کہانیاں اور افسانے لکھے گئے۔ ان کے بارے میں عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کہانی غائب ہے۔ علامت، تمثیل اور الفاظ کا بول بالا ہے۔ قاری کی سمجھ اور سوچ سے بالاتر ہے۔ اور وہ کہانیاں محض ایک صوتی آہنگ کی شکل میں قاری کے سامنے ہیں۔ اس تعلق سے ذوقی کا تاثر یوں ہے:

> ''مجموعی تاثر یہ ہے کہ محض الفاظ رہ گئے تھے۔ ایک صوتی آہنگ ہے، جو فضا میں بکھر رہا ہے۔ ایسے میں ظاہر علی شاہ اس وقت انتظار حسین، حمید سہروردی، حسین الحق کی تمام تر کہانیوں میں نہ صرف زندہ تھے۔ بلکہ مصنوعی فلسفے بھی بکھر رہے تھے۔ یعنی کہا جائے تو ستر کے بعد ہندوستانی افسانہ نگار محض انتظار حسین کے رنگ و آہنگ کی نقل یا تقلید کے علاوہ کچھ نہیں جانتے تھے۔'' ('آب روان کبیر' ص۔ 56)

'آب روان کبیر' میں شامل تنقیدی مضامین کو پڑھنے کے بعد ایک اور بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس دور کے تخلیق کار تنقید نگار سے خوش نہیں تھے۔ کیونکہ تنقید نگار تخلیق کار کے فکشن کے ساتھ اچھا سلوک اور غیر جانبداری سے پیش نہیں آرہے تھے بلکہ نقاد اس سے کہیں زیادہ تیاری کے ساتھ انہیں گمراہ کرنے میں مصروف تھے۔ اور نقادوں کے ذہن میں یہ بات ازبر ہو چکی تھی کہ ان کے بغیر تخلیق کاروں کا قافلہ آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔ ذوقی کے الفاظ ملاحظہ ہو:

> ''اس عہد کی ایک افسوس ناک صورتحال اور بھی تھی۔

''ہے کرتب وقت کے ہاتھوں کا یہ بھی ✧ ترے قد سے ترا سایہ بڑا ہے''
شاداب رضی 09431875126 (ماہنامہ ''آجکل'' مئی 2014)

یعنی اس عہد کے جو نقاد سامنے آئے تھے، ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ دراصل ہم نہ ہوتے تو یہ اشرف نہ ہوتے، حسین نہ ہو تے، سلام بن رزاق یا انور قمر نہ ہوتے۔ یعنی تخلیق کو اونچا اٹھانے" چمکانے" یا فلاپ قرار دینے کی ذمہ داری بس انہی کی تھی۔ یعنی تخلیق کار محض خوش فہمی کے چراغ جلا رہا تھا۔ اور نقاد کے چوبارہ تھے۔" (آب روان کبیر،ص۔63-64)

موجودہ دور کے نقادون سے بھی ذوقی کو شکایت ہے۔ ذوقی کا کہنا ہے کہ نئی نسل میں بھی لکھنے والوں کی ایک لمبی قطار ہے لیکن ان کی تحریروں کو سنجیدگی سے پڑھے بغیر نقاد اپنا فیصلہ سنا دیتے ہیں۔ جس سے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ ذوقی رقمطراز ہیں:

"پہلے کے نقاد ہشیار تھے۔ مطالعہ وسیع تھا۔ اپنی اہمیت کا اندازہ تھا۔ وہ کسی بھی طرح کی ادبی چھیڑ خانی کا نمونہ پیش کر سکتے تھے۔ وسیع مطالعہ نے نقاد کے اندر کی چنگیزیت کو جگا دیا تھا۔ یعنی نقاد پڑھا لکھا تو تھا، مگر جینوئن نہیں تھا۔ وہ کیمپ بنا رہا تھا۔ اپنے نظریاتی کیمپ میں ان کے لیے جگہ بنا رہا تھا۔ آج کے نقاد کا مطالعہ وسیع نہیں ہے۔ وہ فکشن کی برادری سے نظر انداز کیے جانے اور احتجاج کے رویوں سے مایوس ہے۔

حقیقتاً دیکھا جائے تو اردو فکشن کو سب سے نقصان اس کے نقادوں نے پہنچایا ہے۔ یعنی یہ نقاد کی ہی ذات تھی، جس کی چنگیزیت یا غیر سنجیدہ رویے نے تخلیق کاروں کی نسل ختم کر دی۔ نئی نسل کے سامنے آنے کے راستے مسدود کر دیے۔"

(آب روان کبیر، ص۔84)

ادب کی بقا اور سرسبز و شادابی کے لیے تخلیق تنقید اور قاری کا ہونا ضروری ہے۔ تینوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ تخلیق کو قاری تک پہنچانے کے لیے ایک صحت مند اور غیر جانبدار تنقید ضروری ہے۔ گویا ایک نقاد تخلیق اور قاری کے درمیان ایک پل کا کام انجام دیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی نقاد جانبداری اور تعصب کا شکار ہو جائے تو وہ تخلیق کار اور تخلیق کو کہیں سے کہیں پہنچا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ذوقی کا خیال یہ ہے:

"تخلیق، تنقید اور قاری.... ہم خود اس تثلیث کے قائل ہیں۔ مگر نقادوں کے بے رحم رویے، غیر سنجیدہ فکر، مغربی تھیوری کے غلط استعمال اور کیمپ نے آہستہ آہستہ ہمیں اس روشن تنقید کی قندیل سے محروم کر دیا۔ ہم جس کی روشنی میں خود بھی پروان چڑھ سکتے تھے اور اپنے ادب کو بھی پروان چڑھا سکتے تھے۔ اور آج حال یہ ہے کہ ہم ہی نہیں ہوں گے تو ادب کو پروان کون چڑھائے گا۔"

(آب روان کبیر،ص۔91)

الغرض ذوقی کے تنقیدی مضامین کے مطالعہ کے بعد ایسا لگتا ہے کہ ذوقی ادب کے لیے ایک نئی فکر اور ایک نیا فلسفہ کے متلاشی ہیں۔ اور نئے لکھنے والوں کو ایک نئی سمت و رفتار دینے کے خواہاں ہیں۔ آج کی دنیا جس صورتحال سے گزر رہی ہے اور اس کے سامنے جو نت نئے مسائل جنم لے رہے ہیں۔ اس پر سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ادب ہر دور میں سائنس سے زیادہ مقبول رہا ہے۔ ایسی صورتحال میں ادیب اور تخلیق کار کو محدود دائرہ سے نکل کر اس دنیا میں بھی قدم رکھنا ہوگا جہاں ہر ناممکن چیز ممکن ہو چکی ہے۔ انہیں خیالات سے ذوقی کے تنقیدی مضامین 'آب روان کبیر' لبریز ہے۔ گویا وہ ادب میں 'ادب برائے تبدیلی' کے حامی نظر آرہے ہیں۔ اور یہ اردو ادب اور نئی نسل کے لیے کسی نوید سے کم نہیں ہے۔

❀❀❀

"میرے خیال میں منٹو اردو کا وہ عظیم فنکار ہے جس نے نہ صرف اردو فکشن کو نئی سمت سے آشنا کیا بلکہ اس صنف کو اپنی کم عمری کے باوجود دیگر بڑی زبانوں کے افسانوں کے مقابل کھڑا کر دیا"

ڈاکٹر ہمایوں اشرف 09771010715 مضمون "وارث علوی کی منٹو شناسی" (ماہنامہ "آجکل" اپریل 2014)

نظم واپسی

سہیل اختر
09334401450

سُنا ہے پہلے
جہاں میں لوگوں کو
فہم سود و زیاں نہیں تھا
تمام عالم پہ ایک دہشت کی
حکمرانی تھی
اور انسانیت کا نام و نشاں نہیں تھا
پہ اب یہ دنیا
شعور کی کتنی منزلوں سے گذر چکی ہے
حدود ماہ و نجوم کی گرچکیں فصیلیں
نگاہ انساں کی دور بینی کی کھا رہے ہیں
قسم ملائک
مگر ابھی بھی
ضیائے فکر و نظر کے باوصف
زندگی بدحواس کیوں ہے؟
ابھی بھی انساں کو خون انساں کی پیاس
کیوں ہے؟
کوئی بتائے مجھے کہ آخر
یہ کون سی ہے شعور کے ارتقا کی منزل؟

غزل

مشرف حسین محضر
094576597

ہم امین قدروں کے جب کسی سے ملتے ہیں
طاق میں انا رکھ کر عاجزی سے ملتے ہیں

بن گیا ہوں جب سے میں آئینہ صداقت کا
میرے دوست بھی مجھ سے کب خوشی سے ملتے ہیں

طرزِ گفتگو کا کیا معجزہ نہیں ہے یہ
موتیوں کے سوداگر آپ ہی سے ملتے ہیں

آتشیں طلب دل میں اور بھی بھڑکتی ہے
جب بھی وہ سرِ محفل بے رخی سے ملتے ہیں

تجربہ نہ ہو جب تک نیک مت سمجھ لینا
مکر کرنے والے بھی سادگی سے ملتے ہیں

صرف تم سے ملنے پر چین دل کو ملتا ہے
یوں تو ملنے کو محضر ہر کسی سے ملتے ہیں

غزل

عظیم انصاری
09163194776

مدّتوں بعد جنوں اُس کا اُتر تو آیا
مدّتوں بعد سہی لوٹ کے گھر تو آیا

مدّتوں بعد درِ دل پہ ہوئی پھر دستک
مدّتوں بعد کوئی لے کے خبر تو آیا

مدّتوں بعد تبسّم میں چھپایا غم کو
مدّتوں بعد مجھے کوئی ہنر تو آیا

مدّتوں بعد میرے دل میں تمنا جاگی
مدّتوں بعد کوئی خواب نظر تو آیا

مدّتوں بعد بہت ٹوٹ کے برسا بادل
مدّتوں بعد دعاؤں میں اثر تو آیا

مدّتوں بعد گرا دستِ دعاء پہ آنسو
مدّتوں بعد میرے ہاتھ گہر تو آیا

مدّتوں بعد جگا دل میں تصور اس کا
مدّتوں بعد وہی شوقِ سفر تو آیا

مدّتوں بعد حقیقت سے چرائی آنکھیں
مدّتوں بعد تخیل کا نگر تو آیا

مدّتوں بعد ملا پھر کوئی منصور ہمیں
مدّتوں بعد کوئی دار پہ سر تو آیا

مدّتوں بعد ہوا پیڑ وہ سرسبز عظیم
مدّتوں بعد سہی اس پہ ثمر تو آیا

***

"ووبے اندر برا جہان میاں ۔۔۔ دتوںڈتے ہوئے جنوب و شمال"
پرتپال سنگھ بیتاب 09419180824 (ماہنامہ "تحریرِ نو" نئی ممبئی، فروری 2014)

۱۹۸۰ کے بعد کی شاعری کے تخلیقی خدوخال

سلیم انصاری (جبلپور)
07762855355

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دنیا کی کسی بھی فعال اور زندہ زبان کے ادب میں انحراف و بغاوت اور ردّ و قبول کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اور چونکہ اردو بھی ایک زندہ اور متحرک زبان ہے لہٰذا اس زبان کے ادب کا بھی نئے تجربات، تحریکات اور رجحانات کے ردّ و قبول سے گذرنا ایک فطری عمل ہے۔

میرے نزدیک ادبی رجحانات اور تحریکات ہمیشہ ادب کے جمود اور سناٹے کو توڑنے کا کام کرتے ہیں اور ادب میں نئے امکانات اور نئی جہتوں کو روشن کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر تخلیق ہونے والے ادب کے سیاسی ایجنڈے سے انحراف کے نتیجے میں پیدا ہونے والی جدیدیت کے رجحان سے تخلیق کار کو کم از کم یہ آسودگی تو میسّر آئی کہ اس نے اپنا کوئی منشور نہیں بنایا، کوئی ریزولیشن نہیں پاس کیا، کوئی ہدایت نامہ جاری نہیں کیا، بلکہ جدیدیت نے تخلیق کار کی مکمل ذہنی آزادی کی وکالت کی، اظہار کی آزادی کے غیر سیاسی رویوں پر زور دیا اور یہ بات بھی کہی گئی کہ ادب اظہارِ ذات کا وسیلہ ہے۔ یعنی جدیدیت نے بھی غیر شعوری طور پر رفتہ رفتہ وجودیت، اجنبیت اور انسان کی تنہائی کو جدید شاعری کے منشور کے طور پر لاگو کرنا شروع کر دیا جسکا ایک نقصان تو یہ ہوا کہ ذات کے خول میں بند مایوسی، تنہائی، داخلی انتشار اور قنوطیت کے شکار جدید تخلیق کاروں کا رشتہ نہ صرف اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی شعور سے کٹ گیا بلکہ فیشن گزیدہ جدیدیت سے بیزار ہو کر قاری بھی ادب سے کنارہ کش ہو گیا۔ اور یہیں سے شروع ہوا جدیدیت کا زوال۔

چونکہ ادب تغیر پزیر ہے اور اس میں ردّ و قبول کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے، لہٰذا زوال پزیر جدیدیت کے انحراف کے نتیجے میں تخلیق کاروں کی ایک نئی کھیپ سامنے آئی جس نے ایک بالکل نئے تخلیقی رجحان کے تحت لکھنا شروع کیا جسے بعد میں مابعد جدیدیت کا نام دیا۔

مابعد جدیدیت کے علمبردار ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہیں جنکے مطابق مابعد جدیدیت ایک صورت حال ہے یہ کسی ایک وحدانی نظریے کا نام نہیں بلکہ یہ احاطہ کرتی ہے مختلف بصیرتوں اور ذہنی رویوں کا، جن کی تہ میں بنیادی بات تخلیقی آزادی اور معنی پر بٹھائے ہوئے پہرے کو رد کرنا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر وہاب اشرفی اور ڈاکٹر وزیر آغا وغیرہ نے بھی مابعد جدیدیت کی اصطلاح کو نئے تخلیقی ادب کے حوالے سے رائج کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کے مطابق مابعد جدیدیت ایک ایسی صورتِ حال ہے جس میں تخلیق کار یاسیت کی فضا سے نکل کر نئے سماجی اور ثقافتی ڈسکورس میں شامل ہو جاتا ہے۔ اسکے علاوہ مابعد جدید تخلیق کار مکمل ذہنی آزادی کو روا رکھتا ہے اور طے شدہ فکری نہج کو قبول نہیں کرتا اسکے علاوہ مابعد جدیدیت جڑوں کی تلاش اور تہذیبی حوالوں کا احساس دلاتی ہے۔

مابعد جدیدیت کے بنیاد گذاروں کے حوالے سے اگر ہم اس نئی تخلیقی صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کریں تو اس نتیجے پر آسانی سے پہنچ جاتے ہیں کہ مابعد جدیدیت موجودہ عہد کے انسان کی مکمل ذہنی اور فکری آزادی کا مطالبہ کرتی ہے اور رو بہ زوال تہذیبی قدروں اور صارفی سماج میں انسانی مسائل کو وسیع تناظر میں سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔

بعض ناقدینِ ادب کا خیال ہے کہ ۱۹۸۰ کے آس پاس اپنا تخلیقی سفر شروع کرنے والی نسل کا سارا سرمایۂ ادب مابعد جدید تخلیقی رجحان کے تحت ہی تخلیق ہوا ہے مگر مجھے اس سے پوری طرح اتفاق نہیں ہے اور شاید نئی نسل کے زیادہ تر تخلیق کار اسے خود بھی تسلیم نہ کریں تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نئی نسل کے بیشتر شعراء کے یہاں مابعد جدیدیت ایک غالب رجحان کی شکل میں نمو پزیر ہوئی ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ نئی نسل اپنی پیش رو نسل سے کئی معنوں میں منفرد اور مختلف ہے۔ اس نسل کے اپنے مسائل ہیں، اپنے دکھ ہیں، اپنے تحفظات اور تعصبات ہیں، فکر و شعور کا اپنا زاویہ ہے اس کے علاوہ اظہار کا اپنا انداز ہے جس سے میرے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ انٹرنیٹ اور سائبر عہد کے مخصوص مسائل و مصائب کو نئی نسل کے تخلیق کاروں نے اپنے طور پر سمجھ کر ان کے اظہار کا نیا رنگ اختیار کیا ہے اور جدید شاعری کی مخصوص لفظیات کے حصار سے خود کو باہر نکال لیا ہے۔ ۱۹۸۰ کے بعد کی شاعری کا جواز فراہم کرتے ہوئے نئی نسل کے باخبر نقاد کوثر مظہری نے

''ڈاکٹر صدیقی اب بھی چھری کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے اور اندر ہی اندر پریشان ہو رہے تھے کہ وہ چھری جو برسوں سے اُن کی روح میں سمائی ہوئی ہے اسے خود سے الگ کرنا پڑے گا۔'' ڈاکٹر اختر آزاد 09572683122 افسانہ ''چھری'' (افسانوں کا مجموعہ ''سونامی کو آنے دو'')

تھی ہے۔

"آج کی نسل نے خود کو سمجھا ہے ، معاشرے سے اپنی نسبت جوڑی ہے، انکی شاعری کا مرکز اپنی فکر اور اپنا معاشرہ ہے، آج کی نسل جو شاعری کر رہی ہے اسکا رنگ اپنی پیش رو نسل سے جداگانہ ہے کیونکہ آج کی شاعری اپنی لفظیات خود وضع کر رہی ہے جسکے لئے اپنا منطقی جواز ہے"

یہ بات خوش آئند ہے کہ نئی نسل کے تخلیق کاروں میں ایسے لوگوں کی تعداد قابلِ ذکر ہے جنھوں نے اپنی شناخت کے حوالے خود مرتب کئے ہیں۔ اپنی نسل کی شاعری کی چھان پھٹک اور احتساب کی ذمے داری قبول کرتے ہوئے ذہین اور جینوئن تخلیق کاروں کی نشاندہی کا کام بھی کئی نوجوان ناقدین نہایت خلوص اور ایمانداری سے کر رہے ہیں جن میں ڈاکٹر کوثر مظہری، خورشید اکبر، جمال اویسی، ابراہیم اشک، ڈاکٹر مولی بخش اسیر، نعمان شوق، ابرار رحمانی، سرور الہدیٰ، راشد انور راشد، عالم خورشید، معراج رعنا، خالد عبادی، سرور ساجد، عمران عظیم، احمد محفوظ، شمس رمزی اور عطا عابدی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

نئی نسل کی تخلیقی صلاحیتوں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے خورشید اکبر نے لکھا ہے۔ "اردو ادب میں ایک ذہین، حساس اور باشعور نسل رفتہ رفتہ سامنے آرہی ہے جو تحقیق، تنقید اور تخلیقی تینوں سطحوں پر تازہ دم اور حوصلہ مند ہے یہ نئی کھیپ ماضی کے صحت مند اقدار کی بازیافت، حال کے ہمہ جہت عرفان اور مستقبل کی روشن سمت کے لئے مصروفِ ریاضت ہے"

ابراہیم اشک نے نئی نسل کے معنوی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔ "ایک ذہنی رویّہ ختم ہونے پر دوسرا ذہنی رویہ جنم لیتا ہے، ہر نئی نسل کا ذہنی رویہ پرانی نسل سے زیادہ منفرد اور نیا ہوتا ہے۔" ابراہیم اشک کے مطابق ترقی پسند اور جدیدیت کے زمانے میں معنی آفرینی سے اردو کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا اب برسوں بعد وہ رشتہ پھر جڑا ہے اور اعلیٰ کے امکانات روشن دکھائی دینے لگے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ابراہیم اشک نئی نسل کو معنویت کی نسل سے تعبیر کرتے ہیں۔ میرے نزدیک شاعری میں فکر اور اظہار ہر دو سطح پر نیا پن ضروری ہے بھلے ہی اسے کسی بھی نام سے معنون کیا جائے۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ ۱۹۸۰ کے بعد ادبی افق پر روشن ہونے والی نسل کے یہاں بے پناہ امکانات ہیں۔ اس نسل کے پاس دنیا کو دیکھنے کا اپنا نظریہ ہے اپنے تجربات ہیں جسے وہ تخلیقی سطح پر اپنی سوچ کا حصہ بنانے پر پوری طرح قادر ہے۔ اور ایک ایسا ادب تخلیق کرنے کے عمل سے گذر رہی ہے جو یقینی طور پر اپنے پیش رو نسل سے مختلف اور منفرد ہے۔

نئی نسل کے ذہین ناقد جمال اویسی اگرچہ اپنی نسل سے بہت زیادہ پُر امید نہیں ہیں، تاہم انہیں یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ نئے شعراء نئے خیالات کا پرتو تو محسوس کرتے ہیں لیکن انکی زبان نئے خیالات کے اظہار میں ان کا ساتھ نہیں دیتی۔

جمال اویسی کی شکایت بجا اور مجھے بھی یہ بات کھٹکتی ہے کہ نئی نسل کے بعض شعراء کے یہاں تخلیقی ارتکاز اور انہماک کا فقدان ہے۔ مجھے یہ گلہ بھی ہے کہ اس نسل کے کئی شعراء کے یہاں بہت کم وقت میں مشہور ہوجانے کی خواہش بھی ہے اور بغیر زیادہ تخلیقی ریاضت کے، شناخت حاصل کرنے کی جلد بازی بھی، جو یقینی طور پر ایک خطرناک سوچ بھی کہ اس سے نئی نسل پر اعتراض کرنے والوں کو تقویت ہی ملتی ہے، اہم بات تخلیقی ریاضت ہے۔

یہ بات اطمینان بخش ہے کہ ۱۹۸۰ کے بعد اپنی تخلیقی شناخت کا سفر شروع کرنے والی ادبی نسل کے نوجوان ناقدین نے اپنی نسل کی اہمیت اور تخلیقی صلاحیتوں کے حوالے سے کارآمد گفتگو کی ہے اور جہاں کچھ لوگوں کو اس نسل کے یہاں تخلیقی امکانات دکھائی دیے ہیں وہیں کچھ ناقدین نے مایوسی کا اظہار کیا ہے اور خامیوں اور تخلیقی بے راہ رویوں پر گرفت بھی کی ہے۔ راشد انور راشد کے مطابق "موجودہ عہد کی غزلوں میں تبدیلیوں کی آہٹ ہر لحظہ محسوس کی جاسکتی ہے جو غزل کے مستقبل کی ضمانت ہے"

بقول معراج رعنا "۸۰ کے بعد والی ادبی نسل کو مابعد جدید کہنا اور اس کے شعری رویے کو جدیدیت مخالف تصور کرنا دراصل مابعد جدیدیت کے حامیوں کی سازش ہے۔۔۔ نئی نسل کے شعراء کے اشعار سچائی منکشف کرنے میں ایک فعال کردار ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

نعمان شوق نئی نسل کو مشورہ دیتے ہیں کہ ایک سچے فنکار کو اپنے ذہن کے تمام دروازے کھلے رکھنے چاہئیں تاکہ تازہ افکار و نظریات سے نابلد نہ رہے لیکن اپنے قلم کو کسی خاص نظریے کا تابع نہیں بنانا چاہیے۔" عالم خورشید اگرچہ ادب میں نئے تجربات اور تبدیلی کا خیر مقدم کرتے ہیں مگر کسی خاص نظریاتی وابستگی کے بغیر انکے مطابق "میں شعر و ادب میں کسی رجحان، تحریک یا نظریہ کا قائل نہیں۔ ادب تو ذہن کی آزاد اڑان ہے۔ میں بھی وقت اور حالات کی تبدیلیوں کا احترام کرتا ہوں۔ شہپر رسول کو نئی نسل کے یہاں ایک طرح کی تازگی اور ندرت کا احساس ہوتا ہے۔ نئے شعراء کے بالکل نئے اور بدلے ہوئے طریقے نے نئی غزل کے موضوعات، لفظیات اور اس

"خاموش سب کے سب تھے کوئی بولتا نہ تھا ❁ سب مصلحت کے خول میں رہنے لگے یہاں"
ارشد قمر 08092535235 (ماہنامہ "پیش رفت" اپریل 2014)

کے مزاج میں جو ندرت، تازگی اور توانائی پیدا کی ہے وہ بھلی معلوم ہوتی ہے اور اہم بھی۔

نئی نسل کے تازہ دم اور ذہین تخلیق کاروں اور نقادوں کی ان آراء کی روشنی میں، نئی نسل کے تخلیقی سفر کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس نسل کی غزل میں فکر، اسلوب اور اظہار کی سطح پر نمایاں اور خوش آئند تبدیلیاں نمایاں ہوئی ہیں۔ میرے نزدیک مابعد جدید نسل کے جینوئن فنکاروں کا سب بڑا کنٹریبیوشن [contribution] یہی ہے کہ اس نے جدیدیت کے زیر اثر تخلیق شدہ ابہام زدہ شعری ادب سے منحرف اور گمشدہ قاری کی بازیافت کا بے حد اہم کام کیا ہے۔ تنہائی، قنوطیت اور بے یقینی کی فضا میں گم ہوتے ہوئے قاری کو واپس ادب سے جوڑنے کا کام بھی اسی نسل نے کیا ہے۔ ۱۹۸۰ کے بعد کی شاعری نے ماضی کی بے یقین فضاؤں سے نکل کر حال کی تلخ اور ناہموار زمین سے اپنا رشتہ استوار کیا ہے۔ شکست وریخت اور انتشار کے عذاب سے رہائی حاصل کر لی ہے اور مکمل ذہنی آزادی کے ساتھ عصری شعور و آگہی کی روشنی میں اپنے تخلیقی سفر پر رواں ہے۔ نئی نسل کے جینوئن اور نمائندہ شعراء کے تخلیقی نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

اک بھیڑ مجھ سے منتظر انکشاف تھی
میں تھا مراقبے میں، مگر بے حضور تھا

عبدالاحد ساز

اے خدا میری رگوں میں دوڑ جا
شاخ دل پر اک نئی پتی نکال

فرحت احساس

مجھے نہ توڑ میں آئینۂ زمانہ ہوں
ہزار تجھ سے مناسب نہیں کہا میں نے

خورشید اکبر

کھل گئے سارے دہانِ زخم اے فصل نمو
پھول کی صورت بدن کی خاک سے باہر نکل

عالم خورشید

مجھے بھی لمحۂ ہجرت نے کر دیا تقسیم
نگاہ گھر کی طرف ہے قدم سفر کی طرف

شہپر رسول

عجب مشکل ہے کہ آرام سے یہ دن گذرتے ہیں
کوئی ہمدرد ہوتا آ کے میرا دکھ بڑھا جاتا

کوثر مظہری

ذرا جو عظمتِ رفتہ پہ حرف آنے لگے
تو اک بچی ہوئی محراب دیکھ لیتے ہیں

راشد جمال فاروقی

اب کے موسم کا حال کیا کہتے
ہر پرندہ لہو میں تر آیا

فاروق انجینئر

چراغوں کو بجھے عرصہ ہوا ہے
ابھی تک ہم زیارت کر رہے ہیں

ملک زادہ جاوید

شکم کی آگ نے جھلسا دیا تھا جسم و جمال
ہر ایک شخص پہ تھی بے حسی انا چپ تھی

عمران عظیم

ہوں دورِ نو کا میں بھی ایک حصہ
مگر اگلی شرافت چاہتا ہوں

عطا عابدی

مجھ سے بہتر کون لکھے گا بھلا تفسیرِ غم
میں نے ہر آیت پڑھی ہے درد کے قرآن کی

نعمان شوق

چاہا کبھی چھونا جو کسی چاند کو میں نے
پانی میں جھلک اسکی دکھا دی گئی مجھ کو

فراغ روہوی

ہے کون معتبر؟ کروں کس پر یقین میں
غاصب بنے وہی جنہیں سمجھا امین میں

جاوید ندیم

یہاں ان اشعار کو نقل کرنے کا مقصد شعراء کی فہرست سازی نہیں بلکہ نئی نسل کے فکری اور ذہنی رویوں کا اندازہ لگانا ہے۔ ان اشعار کے مطالعے سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ۱۹۸۰ کے بعد اپنا تخلیقی سفر شروع کرنے والی نسل کے یہاں فکر اور اسلوب ہر دو سطح پر نمایاں تبدیلی کا احساس ہوتا ہے اس نسل نے اپنی راہیں خود روشن کی ہیں۔ اس نسل کے یہاں فلسفہ زدگی اور عقلیت پسندی کے عناصر بھلے ہی نہ ہوں مگر یہ بات سچ ہے کہ اس نسل کے یہاں سارا تخلیقی مواد اپنے روز مرہ کے مسائل و مصائب کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ اسکے یہاں سائبر اور انٹرنیٹ عہد اور تیز رفتار زندگی میں درپیش جدوجہد کے نتیجے میں پیدا شدہ صورت حال سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت ہے اور اسکا اظہار نئی غزل میں کرنے کی سلیقہ مندی ہے۔ کسی بھی سیاسی نظریہ اور تحریک سے عدم وابستگی کے باوجود اس نسل نے اپنا ادبی اور تخلیقی رشتہ معاشرے سے برقرار رکھا ہے۔

اگر میں اپنی نسل کے شاعروں سے یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ادب میں شہرت اور شناخت کے لئے کوئی شارٹ کٹ نہیں ہوتا بلکہ صرف اور صرف تخلیقی ریاضت اور مطالعے سے ہی ادبی شناخت حاصل کی جا سکتی ہے تو ہیں مجھے یہ کہنے کا حق بھی حاصل ہونا چاہئے کہ پیش رو نسل کے ناقدینِ شعروادب ۱۹۸۰ کے بعد کی ادبی نسل کے جینوئن اور ذہین تخلیق کاروں سے چشم پوشی کی بجائے انہیں سنجیدگی سے اپنے مطالعے کا حصہ بنانا چاہیے۔

"پریم ناتھ سادھو (پردیسی) نے کشمیر میں عام طور سے اردو نثر اور خاص کر افسانہ نگاری کی راہیں استوار کریں۔ اس لئے انہیں کشمیر کا پریم چند بھی کہا جاتا ہے۔"
ڈاکٹر بریج پریمی رومانی 09419192978 مضمون "اردو افسانہ نگاری میں کشمیری پنڈتوں کا حصہ" (سہ ماہی کتابی سلسلہ "اردو اکادمی" کشمیر جنوری تا مارچ 2014)

اردو و ہندی میں ترقّی پسند افسانوں کا تقابلی جائزہ

ریحانہ سلطانہ
08860438994

پرگتی (ترقی) سنسار میں، زندگی میں تغیر و تبدیلی کی فطری رفتار ہے۔ مارکس نے جدلیاتی مادیت کے اصول کے تحت بتایا تھا کہ تاریخ کا ارتقا بالضد ہمیشہ آگے کی طرف ہوتا ہے۔ قوموں و ملکوں کی تاریخ میں نشیب وفراز اور عروج وزوال آتے رہتے ہیں لیکن تاریخ کا سفر آگے کی طرف جاری رہتا ہے۔ یہ ارتقا ایک سیدھی لکیر میں نہیں ہوتا بلکہ اس میں اُتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں لیکن یہ ہمیشہ ترقی کی طرف گامزن ہے۔ آج سے پانچ سو سال پہلے جیسی دنیا تھی ویسی اب نہیں ہے۔ ہر شعبہ میں زبردست ترقی ہوئی ہے۔ ریل گاڑی، موٹرکار، ہوائی جہاز، ٹیلیفون، بلب، ٹیلی ویژن، راکٹ، ایٹم بم اور سینکڑوں ایجادات پانچ سو سال قبل نہیں تھیں، آج ہم ان سب کو دیکھتے ہیں، جانتے ہیں۔ اسی طرح سماج، معاشیات، سیاست اور ادب میں بھی تبدیلیاں آئی ہیں اور یہ بھی ترقی کی طرف گامزن ہوئے ہیں۔ اردو میں پرگتی واد یا ترقی پسندی کا مفہوم یہ ہے کہ زندگی کی جن حقیقتوں کو لائقِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا اُن پر خصوصی توجہ دی گئی۔ سماجی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کے تمام پہلوؤں کی ادب میں عکاسی کی گئی۔ پسماندہ طبقوں، غریبوں، مزدوروں، کاشتکاروں کی زندگی کو اُجاگر کیا گیا۔ عورتوں کو برابر کے حقوق دینے پر زور دیا گیا، سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ، جبر، استحصال اور مذہبی ریاکاری کا پردہ فاش کیا گیا۔ ۱۹۱۷ء میں جب روس میں انقلاب آیا اور مزدوروں کی حکومت قائم ہوئی تو ادب پر بھی اس کا گہرا اثر پڑا۔ مارکسزم کا جنم تو انیسویں صدی کی آخری دہائی میں ہو چکا تھا لیکن روس میں ۱۹۱۷ء میں اسے عملی جامہ پہنایا گیا۔ اردو افسانہ میں حقیقت نگاری اور غریبوں و پسماندہ طبقوں کی زندگی کی عکاسی کا آغاز پریم چند نے کیا تھا۔ ہندی افسانہ میں بھی اس کے آغاز کا سہرا پریم چند کے سر ہے۔ پریم چند کی ہندی کہانیوں میں تقریباً وہی رجحانات ہیں جو اردو کہانیوں میں ہیں۔ کیونکہ پریم چند کی ہندی و اردو کہانیاں زیادہ الگ نہیں ہیں۔ انہوں نے پہلے اردو میں کہانیاں لکھیں اور پھر ان کا ترجمہ ہندی میں کیا۔ ایسا بھی ہوا کہ پہلے ہندی میں کہانیاں لکھیں اور پھر اس کا ترجمہ اردو میں کیا۔ کہیں کہیں ہندی اور اردو کی کہانیوں میں فرق بھی ہے۔ مگر پریم چند کا نقطۂ نظر، فن، اصول اور مقصد اردو ہندی کہانیوں میں یکساں ہے۔ ان کے ہندی افسانوں میں اردو افسانوں کی طرح ہی انقلابی اور باغیانہ رنگ کم ہے اور اصلاحی و مثالی رنگ زیادہ ہے۔ پریم چند مارکسزم سے متاثر تھے، اس کا اظہار ان کے آخری دور کے ناولوں اور افسانوں میں ہوا ہے۔ ۱۹۱۹ء میں منشی دیانارائن نگم کو لکھے گئے ایک خط میں انہوں نے واضح طور پر کہا تھا "میں اب قریب قریب بولشیوسٹ اصولوں کا قائل ہو چکا ہوں"۔

پریم چند نے مظلوموں پر ہونے والے جبر وظلم کو نشانہ بنایا۔ طبقاتی جدوجہد کو سب سے پہلے پریم چند نے ہی اجاگر کیا۔ پریم چند کی ہندی کہانیوں میں شانتی، نشہ، ٹھاکر کا کنواں، شکار، کسم، خدائی فوجدار، نیائے (انصاف)، باسی بھات میں خدا کا ساجھا، قانونی کمار، نرک کا مارگ، بھاڑے کا ٹٹو، مندر، بینک کا دیوالہ، جوالا مکھی، آہوتی، کفن وغیرہ میں جبریت و استحصال کی مخالفت کی گئی ہے۔ پریم چند یگ (۱۹۱۵ء۔ ۱۹۳۶ء) کے دیگر ہندی افسانہ نگار مثلاً وشمبر ناتھ کوشک، سدرشن، پانڈے بیچن شرما اُگر، بھگوتی پرشاد واجپئی، ونود شنکر ویاس، رادھا کرشن، الاچندر جوشی، نرالا، پنت وغیرہ کے یہاں بھی پریم چند کا ہی رنگ ملتا ہے۔

۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین اور پرگتی شیل لیکھک سنگھ کا قیام عمل میں آیا۔ ہندی افسانہ میں پرگتی واد (ترقی پسندی) کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

پریم چند کے افسانے "کفن" (۱۹۳۶ء) نے ترقی پسند فکر کے ہم آہنگ شعور کی اعلیٰ مثال پیش کی۔

"انگارے" کے افسانہ نگاروں اور پریم چند نے استحصال، طبقاتی تفریق، مہاجنی نظام، جاگیر دارانہ ظلم وستم، سامراجیت، غلامی، دولت کی غیر مساوی تقسیم، اونچ، نیچ، مذہبی، کٹر پن پر بھرپور طنز کئے۔ ۱۹۳۶ء میں جب اُردو میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو ہندی میں بھی اس کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اُردو میں ترقی پسندی اور ہندی میں پرگتی واد کے اصول ونظریات یکساں تھے، دونوں ہی اشتراکی فلسفہ سے متاثر زبانیں تھیں، پریم چند نے ہی ہندی میں ادب برائے زندگی، مقصدیت اور افادیت پر زور دیا۔ دیہاتی لوگوں، کسانوں، مزدوروں، واچھوتوں

"نہیں ہے بس میں کسی کے بھی خوبرو ہونا ؎ خدا کی دین ہے پھولوں میں رنگ و بو ہونا"
ڈاکٹر انتخاب اثر 09204296090 (ماہنامہ "پیش رفت" اپریل 2014)

کی زندگی کے مصائب پریم چند نے ہی ہندی افسانوں میں پیش کیے۔

اردو میں پریم چند کے بعد کرشن چندر کی افسانہ نگاری کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، پریم چند کے ابتدائی افسانوی مجموعے "طلسم خیال" اور "جہلم میں ناؤ پر" میں رومانیت وحقیقت کا حسین امتزاج ہے۔ رومانی رجحان اور رومانی انقلابیت کرشن چندر کے بہت سے افسانوں میں پایا جاتا ہے۔ فطرت کے حُسن اور عورت کے حسن کو وہ کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ تلخ سماجی حقیقتوں کو بھی وہ حسین فطری مناظر کے پس منظر میں پیش کرتے ہیں، سماجی ناانصافیوں کو وہ معاشی ومعاشرتی عدم مساوات کا نتیجہ مانتے تھے، ان کے افسانوں میں دلکش طنز ہر جگہ مل جائے گا۔

اُردو میں راجندر سنگھ بیدی کے یہاں ترقی پسندی اور نفسیاتی حقیقت نگاری کا بہترین امتزاج ہے، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی اور اوپندر ناتھ اشک کے یہاں اشتراکی حقیقت نگاری کا گہرا عکس ہے۔

ہندی افسانہ میں یشپال، اوپندر ناتھ اشک، راہل سانکرتیاین، رانگے راگھو، امرت رائے، امرت لال ناگر، دھرم ویر بھارتی، منمتھ ناتھ گپت، رامیشور شکل انچل، موہن سنگھ سینگر اہم ترقی پسند افسانہ نگار ہیں، ان کے علاوہ وشمبر ناتھ کوشک، پانڈے بچن شرما اُگر، جینندر، الاچندر جوشی، اگیے، نرالا پر بھی اشتراکی حقیقت نگاری اور ترقی پسندی کے اثرات ملتے ہیں، لیکن انہوں نے داخلی جذبات واحساسات اور نفسیاتی حقیقت نگاری پر زیادہ توجہ دی، کرشن چندر کی کہانی "ان داتا" اور یشپال کی کہانی "روٹی کا مول" ساتھ ساتھ پڑھی جائے تو ان میں یکساں موضوع اور طرزِ اظہار سامنے آتا ہے، دونوں افسانوں میں مہاجن اور جاگیردار اور سرمایہ دار غلہ اپنے گوداموں میں بھر لیتا تھا، غریب کسان اور مزدور بھوکے مرنے لگے، کرشن اور یشپال کی کہانیوں کے بہت سے موضوعات ایک جیسے ہیں، لیکن ایک خاص فرق یہ ہے کہ کرشن چندر کے یہاں خطابت، نعرہ زنی اور کھردراپن اتنا زیادہ نہیں ہے جتنا یشپال کے یہاں ہے، یشپال کے بعض افسانوں کے کردار تو خالص تقریریں کرتے ہیں جس سے فن مجروح ہوتا ہے، کرشن چندر نے جس طرح "جگن ناتھ" میں مابعد الطبیعاتی اور روحانی زندگی پر تیکھے طنز کیے ہیں یشپال نے اسی طرح اپنی کہانی "پرلوک" میں ان رجحانات اور مذہبی توہم پرستی پر تیکھے طنز کیے ہیں، طبقاتی تفریق کو جس طرح کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی اور راجندر سنگھ بیدی نے اُردو افسانوں میں اجاگر کیا ہے، اسی طرح ہندی افسانوں میں یشپال، رانگے راگھو، امرت رائے، امرت لال ناگر، منمتھ ناتھ گپت وغیرہ نے اجاگر کیا ہے، ہندی میں راہل سانکرتیاین ایک عظیم افسانہ نگار تھے، ان جیسی تاریخی بصیرت، سماجی وطبقاتی تفریق کا اعلیٰ درجہ کا شعور اُردو میں کسی ترقی پسند افسانہ نگار کے یہاں نہیں ملتا۔

راہل کے افسانے والگا سے گنگا، ریکھا بھگت، سُمیر، پربھا، بابو نوردین، مانو سماج وغیرہ افسانے ہندی میں پرگتی وادی وچار دھارا کا نہایت بیش قیمت سرمایہ ہیں، ان میں جو گہری فکر، فلسفیانہ تجزیہ اور فنی عظمت پائی جاتی ہے وہ اُردو کے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں بہت کم ہے۔ ہندی کے افسانہ نگاروں کے اسلوب، ہیئت اور تکنیک میں اس دور میں نئے تجربات بہت کم کیے۔

انہوں نے روایتی بیانیہ اسلوب کو ہی اختیار کیا، کردار نگاری کے بجائے واقعہ نگاری پر زیادہ توجہ دی، لیکن اُردو کے ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اسلوب، ہیئت، تکنیک، میں نئے تجربے بھی کیے، انہوں نے استعاراتی اور علاماتی انداز کو بھی اختیار کیا، ہیئت اور تکنیک میں نئے تجربے کیے، مثلاً کرشن چندر کے افسانے "ان داتا" میں ڈائری وخطوط کا طریقہ اختیار کیا گیا، سعادت حسن منٹو نے "پھندنے" میں استعاراتی اسلوب اختیار کیا، کرشن چندر نے کئی افسانے ایسے تحریر کیے جن میں استعاراتی اور علامتی انداز بہت واضح ہے، مثلاً غالیچہ، الٹا درخت، ہاتھ کی چوری، بت جاگتے ہیں، گڑھا، مردہ سمندر، نیلی کی گولیاں، ان افسانوں میں تجریدیت کے تجربات بھی کیے گئے۔

قرۃ العین حیدر کے افسانے "آہ میرے دوست" مرزا ادیب کا افسانہ "دلِ ناتواں" غیر علامتی اور تجریدی افسانوں کے نمونے ہیں "شعور کی رو" کو اختیار کر کے اردو افسانوں کا آغاز ہو چکا تھا، ترقی پسند دور کی ابتدا ہی میں سجاد ظہیر "لندن کی ایک رات" ناول لکھ چکے تھے، جس میں شعور کی رو کی تکنیک استعمال کی گئی ہے، قرۃ العین کے افسانوی مجموعے "پت جھڑ کی آواز" میں کئی افسانوں میں شعور کی رو کا اثر ہے، ترقی پسند دور کے اردو افسانوں میں نئی تشبیہات، استعارے اور علامتیں خوب استعمال ہو رہی تھیں لیکن ہندی میں پرگتی وادی افسانہ نگاروں کے بیشتر افسانے سپاٹ اور بیانیہ انداز کو ہی اپنائے ہوئے تھے، ترقی پسند افسانہ نگاروں میں عموماً فن اور مقصد ہم آہنگ نظر آتے ہیں، لیکن ہندی میں مقصد فن پر حاوی نظر آتا ہے، اُردو کے مقابلے ہندی میں بات سیدھے سادے انداز میں کہی جاتی ہے جبکہ اردو میں اسے استعارے، تشبیہات، تمثیل اور تلمیحات کے ذریعے کہنے کا عام رواج ہے، ترسیل وابلاغ کی سطح پر ہندی افسانے زیادہ واضح ہیں، ترقی پسند دور میں اُردو افسانہ نگاروں نے کئی اعلیٰ درجہ کے افسانے لکھے اور کئی اعلیٰ درجہ کے کردار تخلیق کیے لیکن ہندی میں اس دور میں

"عصمت چغتائی کی "ٹیڑھی لکیر" کے پلاٹ، قصے میں خوبیوں کے علاوہ چند خامیاں بھی ہیں۔ ناول کے آخری حصے میں بے ربطی کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناول کا انجام بکھرا بکھرا سا معلوم ہوتا ہے۔" مصنف محبوب حسن 08527816385 (کتاب "عصمت چغتائی اور جین آسٹین" صفحہ 127)

اعلیٰ درجہ کے افسانوں کی تعداد بہت کم ہے، اس دور میں اردو و ہندی کے افسانہ نگاروں نے عصری حقیقتوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا، لیکن ہندی میں صحافتی انداز زیادہ پایا جاتا ہے، وقتی اور عارضی واقعات پر امرت رائے نے ہندی میں کئی افسانے لکھے، مثلاً یورپ کی وجئی جتا کے نام، ایٹمی سلطان ئرومین کے نام، کوریا کا نیا بھوگول، گوڈسے کے نام کھلا پتر وغیرہ، امرت لال ناگر کا افسانہ ایک تھا گاندھی، پانڈے بچن شرما گر کی کرانتی کاری کہانیاں اس کی وجہ سے ہندی میں صحافتی انداز زیادہ پایا جاتا ہے، اُردو میں خطابت اور نعرہ زنی کرشن چندر کے کئی افسانوں میں بہت زیادہ ہے، خصوصاً "ہم وحشی ہیں" اور "گھونگھٹ میں گوری جلے" کے افسانوں میں مضمون نگاری کا انداز پایا جاتا ہے "روزن برگ کی موت پر" کرشن چندر کا ایسا افسانہ ہے جو تقریر کا انداز رکھتا ہے، خصوصاً تقسیم ہند کے بعد ان کی (کرشن چندر کی) افسانہ نگاری میں ٹھہراؤ کم اور خطابت کا عنصر بڑھتا گیا"۔(اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک از خلیل الرحمن اعظمی ص ۱۸۷)

ہندی کے پرگتی وادی افسانہ نگاروں کے افسانوں میں خطابت، نعرہ زنی، تقریر بازی اور موضوعات کی تکرار کچھ زیادہ ہی ہے، اس نے فن کو نقصان پہونچایا اور زیادہ تر قاری اس طرز کے افسانوں سے اکتا گئے، ۱۹۶۰ء کے قریب اُردو اور ہندی میں افسانہ نگاری نے ایک نئی کروٹ لی، جدید طرز احساس نے افسانوں کو بہت حد تک بدل دیا، صنعتی معاشرے کی حشر سامانیوں نے فرد کی ذات کو ایک بحران میں مبتلا کر دیا، تنہائی، بے چارگی، لاسمتی، اقدار کی شکست و ریخت، کنبہ پروری، رشوت خوری، جمہوری اداروں کی ناکامیابی، عقائد اور فلسفوں کی شکست نے نئی افسانہ نگاری کو جنم دیا۔

❀❀❀

غزل

بی ایس جین جوہر
09358400900

ملک کا کوئی بھی باشندہ، ہندو ہو کہ مسلماں ہو
کوئی حکومت بھی ہو ہند میں سب لوگوں کی نگہباں ہو

ذات پات ،مذہب، مسلک کا راج نیتی میں کام نہ ہو
سب کو ایک نظر سے دیکھے، سب کی بقا کی خواہاں ہو

گلشن گلشن پھول کھلیں ،اور خرمن خرمن بھرے اناج
کوئی نہ بھوکا سوئے رات میں ،گھروں میں سب کے چراغاں ہو

سونے کی چڑیا کے نام سے تھا مشہور زمانے میں
کاش کہ ذرّہ ذرّہ اس کی مٹی کا زر افشاں ہو

بھارت ماں کی کوکھ سے کوئی ایسا لال بھی پیدا ہو
جس کی ایک آواز پہ سارا ہندوستان رجز خواں ہو

چاند ستارے، موسم، بادل، بجلی جھک کر کریں سلام
آسمان سے سونا برسے، خوب مطمئن دہقاں ہو

روزی، روٹی، بیٹی کی فکروں سے ہوں آزاد سبھی
علم و عمل کی شعر و سخن کی فن کی شمع فروزاں ہو

روگ، بڑھاپے، موت، اپاہج پن پہ کریں تحقیق و علاج
اوسط عمر بڑھانے میں بھی کامیابی کا امکاں ہو

ہر سماج کا، ہر طبقے کا، ہر مذہب ہر ملت کا
حال بھی اطمنان بخش ہو ، مستقبل بھی درخشاں ہو

اردو ہندی دو بہنیں ہیں ،دیش میں خوب پھلیں پھولیں
ایک سے ایک کوی پیدا ہو،ایک سے ایک غزل خواں ہو

❀❀❀

"سراب دیکھنے والوں نے اپنی کاوش پر ❀نقوش پاسے سمندر نکلتے دیکھا ہے"
راشد طراز 09934628955 (ماہنامہ "آجکل" جنوری 2014)

منی کہانی

غزل

زرینہ خان
09897305937

مری زندگی میں کمی نہیں
مگر آج تک میں ہنسی نہیں

ترے غم سے ہوں جو میں منسلک
مجھے جستجوِ خوشی نہیں

مجھے کیا منائے گا وہ بھلا
میں نے زندگی کبھی جی نہیں

مرے خواب سارے بکھر گئے
مگر آنکھ میں تو نمی نہیں

ہوا مدتوں کا جو فیصلہ
کوئی یاد باقی بچی نہیں

بھی جلتے جلتے میں بجھ گئی
بھی بجھ کے بھی میں بجھی نہیں

وہ جو آئے زرّیں کو جو دیکھنے
تو اُدھر نگاہ اُٹھی نہیں

❁❁❁

غزل

عبدالجلیل عباد (جرمنی)
ebad53@googlemail.com

پیار کرنا ہے تو پھر مجھ سے ہی بس پیار کرو
یوں محبت کو تو گلیوں میں نہ بازار کرو

دل تو اب دے ہی چکے اور تمہیں کیا چاہیئے
جاں بھی لینی ہے تو پھر عشق کو تلوار کرو

یوں کنارے پہ کھڑے ہو کے صدائیں مت دو
عشق کی آگ کے دریا کو بھی تو پار کرو

مجھ سے ملنا ہے تو دن رات کا جھگڑا کیا ہے
جب بھی دل چاہے خیالوں میں بھی گفتار کرو

روح کو روح کے جذبات میں مدغم کر دو
تن بدن اپنا زیادہ نہ گنہگار کرو

وقت کا کیا ہے پتہ کہ یہ چلے گی کونسی چال
دل میں جو کچھ ہے تمہارے، وہ تو اظہار کرو

کس کی تو کھوج میں دن رات بھٹکتا رہتا
میں تو ہوں دل میں نہاں، میرا تو دیدار کرو

جل رہا کب سے کڑی دھوپ میں اک شجر اُداس
اپنی اک نظر کرم اس پہ بھی سرکار کرو

❁❁❁

غزل

آستغنی مشتاق رفیقی
09504969822

جو برسوں ساتھ رہا بدل گیا کیسے
یہ رشتہ ٹوٹا کہاں، حادثہ ہوا کیسے

اُسے تو علم تھا تنہائی موت ہے میری
اکیلا چھوڑ کے مجھ کو وہ چل دیا کیسے

وہ شخص جس نے جلایا مرے نشیمن کو
مجھی سے پوچھ رہا یہ گھر جلا کیسے

ہر اک سمت میں سازش کے جال بکھرے تھے
وہ میرے شہر سے بچ کر نکل گیا کیسے

میں اُسی کے بزم سے کیوں تشنہ کام لوٹ آیا
یہ مجھ سے ہو گئی اتنی بڑی خطا کیسے

گناہ کرتا رہا، کر سکا نہ توبہ بھی
مجھے معاف کرے گا مرا خدا کیسے

تُو ایک پھول ہے کھِلتا ہے جو خلاؤں میں
اُڑا کے لائے گی خوشبو تری صبا کیسے

رفیقی اُس کو ہنسانا بہت ہی مشکل تھا
تمہاری بزم میں وہ کھُل کے ہنس پڑا کیسے

❁❁❁

"دیکھا اتنے سارے پیسے، یہ تیرے مجسمے تجھے کیا دیں گے، میں نے لاکھوں میں وہ ایک مجسمہ بیچ دیا ہے جو کسی سوتن کی طرح میری کوکھ کا درد بنا ہوا تھا۔"
احمد کلیم فیض پوری 09028825045 افسانہ "انگلو" (ماہنامہ "آجکل" جنوری 2014)

افسانچہ

انداز اپنا اپنا

نور جمشید پوری، ریاض

"اُف۔۔۔ پاپا، آپ بھی نا۔۔۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا۔۔۔ کہ بس سے اُتر کر اسی جگہ کھڑے رہیئے گا، میں آپ کو وہیں سے پک اپ کرلوں گا۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔ آپ کو تو بس مجھے پریشان کرنا ہوتا ہے۔۔۔ پتہ ہے آپ کو؟۔۔۔ پچھلے ۱۵ منٹ سے لگاتار آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔۔۔ میں کتنا ٹینشن میں تھا آپ کے لئے۔۔۔!!!

"بیٹا۔۔۔ وہ دھوپ۔۔۔ ذرا تیز تھی۔۔۔ تو بس۔۔۔ سائے کے لئے۔۔۔ اس چائے کی۔۔۔ دکان کے اندر۔۔۔۔۔۔

"سائے کے لئے؟۔۔۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ مجھے بدنام کرنے کے لئے۔۔۔ کہیں چائے دیکھی نہیں کہ بس۔۔۔ جیسے گھر پر تو ملتی ہی نہیں۔۔۔ ابھی صبح ہی تو پی تھی نا۔۔۔ پھر؟۔۔۔ ہاں! لوگ کیسے جانیں گے کہ بے چارے آج کل چائے کو بھی ترسنے لگے ہیں۔۔۔ نسرین صحیح کہتی ہے۔۔۔ آپ ہمیں ذلیل وخوار کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے ہیں۔۔۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہے آپ کو کچھ کہنے کا۔ آپ تو وہی کریں گے جو۔۔۔

دھوپ بدستور تیز تھی، لیکن بیٹے کے تیز الفاظ سے کم۔۔۔ دھوپ کی شدت تو پھر بھی قابلِ برداشت تھی، لیکن بیٹے کے زہر آلود الفاظ کی چبھن۔۔۔ خدا کی پناہ! ایک ہی سانس میں وہ نہ جانے کیا کیا بکتا رہا۔۔۔ باپ کی بوڑھی نظریں گم صم سی اُسے تکتی رہ گئیں۔ اُس نے کچھ کہنے کی کوشش بھی کی تو جیسے الفاظ حلق میں اٹک کر رہ گئے

اس بیچ بیٹے کا موبائل بج اُٹھا اور وہ کسی سے باتیں کرنے لگا۔ بوڑھے کا دل رو اُٹھا۔ اُس کے ذہن کے پردے پر ۲۰ سال قبل کی یادیں ایک فلم کی مانند اُبھرنے لگیں۔ جذبات کی شدت سے لب خاموش تھے لیکن دل ہی دل میں وہ بڑبڑا رہا تھا۔ "جانتے ہو بیٹا؟۔۔۔ میلے میں ٹکٹ لینے کے لئے میں نے تمہاری اُنگلی چھوڑی ہی تھی کہ تو نہ جانے کہاں غائب ہوگیا۔ مجھے تو ہوش بھی نہ رہا تھا کہ ٹکٹ کدھر گیا۔ میں پاگلوں کی طرح تمہیں تلاش کر رہا تھا۔ مجھے ہر بچے میں تمہاری جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ اُن دو گھنٹوں میں میں نے کتنی منتیں مانگ لی تھیں۔۔۔ صدقے کی رقم غریبوں میں بانٹنے کا ارادہ کیا تھا۔ اور تو اور میں نے میلے میں تمہارے لئے اعلان بھی کروا دیا تھا۔ لیکن تُو تو سارے شور شرابے سے بے خبر بُڑھیا کے بال والی مٹھائی کو بنتے ہوئے دیکھنے میں مگن تھا۔ جانتے ہو بیٹا؟

پا کر میں تجھ سے بالکل ناراض نہیں ہوا تھا۔ بلکہ میں بے انتہا خوش ہوا تھا اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا تھا۔ ساتھ ہی تجھے پاگلوں کی طرح چوم بھی رہا تھا۔ زبان کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔۔۔ اور آج تُو۔۔۔ صرف ۱۵ منٹ میں ہی۔۔۔ خیر کوئی بات نہیں بیٹا!۔۔۔ میں جانتا ہوں ناراض تو شاید تُو بھی نہیں ہو رہا ہوگا مجھ پر۔۔۔ بس انداز اپنا اپنا ہے بیٹا!!!

❀❀❀

افسانچہ

ٹور

اشتیاق سعید
09224799971

بچوں کی ضد تھی کہ اب کی گرمی کی چھٹیاں ہندوستان کے ہل اسٹیشن یا تاریخی مقامات پر نہیں بلکہ بیرون ممالک میں سے کہیں گذاریں گے، خواہ نیپال ہی کیوں نہیں جایا جائے۔ بچوں کی اس ضد سے وہ خاصا پریشان تھا۔ گذشتہ سال کی چھٹیوں میں بچوں کو ہوائی جہاز سے لکھنؤ لے گیا تھا۔ ہفتہ بھر کا ٹور تھا۔ فی کس پچاس ہزار روپیوں کا صرفہ آیا تھا۔ اب بیرون ممالک کے سفر میں خواہ نیپال جائیں یا سری لنکا لاکھ سوا لاکھ سے کم کا تخمینہ تو ہوگا ہی۔ وہ یہ سوچتا ہوا بس اسٹاپ پر پہنچ گیا، اچانک بس اسٹاپ پر لگے اشتہار پر اُس کی نگاہیں گڑ گئیں۔ لکھا تھا "حج اور عمرہ ٹور" پندرہ دنوں کے لئے محض چالیس ہزار روپے مع طعام وقیام کے۔ اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور زبان سے بے ساختہ نکلا "واہ! عمرہ کا عمرہ اور ٹور کا ٹور۔۔۔"

❀❀❀

"یوں دیکھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ ہندی گیت سے اردو گیت کے سفر میں جتنے چشمے، ندیاں، اور نالے آئے تھے وہ سب جیسے ایک دریا میں ڈھل گئے اور اردو گیت کے اس دریا کا نام مہیندر اگر فراز حامدی" حیدر قریشی (جرمنی) ("آنسو آنسو برکھا" صفحہ 82)

افسانچے

(۱) نئی راہ

رحیم رضا
09890007154

۱۰ ارسال کا طویل عرصہ گذرنے اور کئی درگاہوں اور تیرتھ استھلوں کے چکر لگانے کے بعد بھی کملہ ماں نہ بن سکی بالآخر ایک ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے راجیش نے جدید سے جدید طریقہ اپنایا اور کلپنا نے راجیش کے بچے کو جنم دیا۔

راجیش اپنی پتنی کملہ کو یہ خوشخبری فون پر دے رہا تھا اور کلپنا کبھی اپنے نوزائیدہ بچے کی طرف اور کبھی راجیش کی طرف دیکھ رہی تھی کلپنا کی غربت، بے بسی اور لاچارگی دیکھ کر وہ بھی تڑپ اٹھا۔ وہ سوچنے لگا" کاش! میں راجیش کی جگہ راشد ہوتا تو بچے کے ساتھ اسکی ماں کو بھی اپنا لیتا۔ وہ رات بھر اسی اُلجھن میں مبتلا رہا۔

صبح جب وہ سو کر اُٹھا تو اُس کا دل بے حد مطمئن تھا۔ اُس نے اپنے وکیل دوست کو رام نگر والے مکان اور اُس سے منسلک باغیچے کا وصیت نامہ تیار کرنے کے لئے بلایا تھا کلپنا کے حق میں!!!

(۲) تیسرا شخص

ساجد اور حامد میرے دوست تھے جب ہم تینوں مل جاتے خوب باتیں ہوتیں اکثر ایسا ہوتا کہ ساجد کو کوئی کام یاد آجاتا اور اس کے جاتے ہی حامد اس کی برائیاں شروع کردیتا کبھی حامد کو آنے میں دیر ہوجاتی تو ساجد موقع پاکر اس کے عیب گناتا۔

ایک دن ہم تینوں بہت دیر سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے دونوں سے جانے کی اجازت چاہی تو دونوں نے کہا نہیں یار تم اگر واپس نہیں آئے تو ہم یہاں کیا کریں گے؟

میں نے کچھ نہیں کہا۔ ہاں! میری گہری نظروں کی تاب نہ لاکر دونوں شرمسار ضرور ہوگئے۔!!!

(۳) ادب اور سیاست

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا قریب کی میز پر دو لوگ باتیں کر رہے تھے۔ "یار آج کل ہر طرف الیکشن کی دھوم ہے جگہ جگہ پرچار سبھائیں ہو رہی ہیں۔ لیڈر لوگ دھواں دھار بھاشن کر رہے ہیں اور شعر بھی خوب سنا رہے ہیں" ایک کہہ رہا تھا۔

"جی ہاں! سیاست میں ادب بھی شامل ہو یہ تو اچھی بات ہے، لیکن ادب میں سیاست ہو یہ بُرا ہے، جو آج ہو رہا ہے۔!!!

❁❁❁

افسانچے

(۱) نحوست

سراج فاروقی ممبئی
08108894969

بلی اپنے اڈے پر پہنچ کر رونے لگی تو ایک بلے نے سوال کیا،" کیا ہوا بی بی؟ کیوں رو رہی ہو......"

"آج ایک انسان نے میرا راستہ کاٹ دیا ....." بلی بلکتے ہوئے بولی۔

"کیا......" بلا اس کے اس بیان پر چونک سا گیا۔

"ہاں...!" بلی نے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن ہم انسانوں کے لئے نحوست تھے۔ ان کے آگے سے گزرنا اُن کے لئے نحوست میں شمار تھا۔ مگر آج میں یہ کیا سن رہا ہوں... انسان بڑی بی کے آگے سے گذر گیا اور نحس ہوگیا۔

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو......" بلی نے آنکھیں میچتے ہوئے کہا،" ایک وقت تھا جب ہم انسانوں کے لئے نحوست میں شمار تھے مگر اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب انسان خونی، دغاباز ، مکار، بلاتکاری، رشوت خور، اپنی ہی ماں، بہنوں اور بیٹیوں کو ہوس کا شکار بنانے والا ہوگیا ہے۔ اس لئے اب وہ ہمارے لئے نحوست ہوگیا ہے......"

(۲) عقیدت

چاروں بہنیں ثمرا، انوسہ، ہتول اور پونہ سے بہ نفس نفیس زیوروں سے لدی پھندی، کاسمیٹک سے سجی سنوری، خوب چٹک رنگ کے ملبوسات میں نہایت ہی تزک و احتشام کے ساتھ تشریف لائیں۔

بہترین کیٹررس کو بلایا گیا اور اعلیٰ قسم کا طعام تیار کیا گیا۔ ایک مولوی کو بلا کر قرآت کرائی گئی ،اس کے بعد فاتحہ خوانی ہوئی۔ جب یہ سب معاملہ نپٹ گیا تو ماں نے اپنی بیٹیوں اور بہوؤں کو اطلاع دی کہ" چلو کھانا کھالو... فاتحہ خوانی ہوگئی ہے..."

بیٹیاں اور بہوئیں جو اس وقت دوسرے کمرے میں بیٹھی ٹی وی پر اپنے فیوریٹ پروگرام سے لطف اندوز ہو رہی تھیں، قہقہہ بردوش انداز میں اپنے اپنے زیوروں اور ملبوسات کو سنبھالتے ہوئے بصد ناز و انداز کے اٹھیں اور ڈائننگ ہال میں جاکر۔ کانٹوں اور چمچوں کی مدد سے کھانا شروع کردیا۔ اسی دوران انکے شوہر بھی آگئے۔ انہوں نے اس محفلِ زعفران زار کو رونق بخشا۔ دوسرے دن "دبنگ ٹو..." کی ۱۷ ٹکٹیں آئیں اور سب لوگ فلم دیکھنے 'مال' کی طرف چل پڑے۔ موقعہ تھا والد صاحب کی پہلی برسی کا!!!

❁❁❁

"سڑک ہے اور سڑک پر بے انتہا بھیڑ اور بھیڑ میں شامل وہ۔ بھیڑ میں خاموشی ہے۔ سناٹا ہے۔ بھیڑ اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ منزل، جس کا کوئی پتہ نہیں۔" انور امام 09931163152 افسانہ "پچاس" (سہ ماہی "ابجد" اررید جولائی تا دسمبر 2013)

شب گزیدہ امکان

شارق عدیل
09368747886

اینٹ اور گارے سے بنائی ہوئیں
عمارتیں بھی ہمارے ملک میں
فریب و مکر سے نا آشنا لوگوں کی
زندگی سے زیادہ قیمتی ہوگئی ہیں
اس لئے
تاریخی عمارتوں کی جانچ پڑتال
کرتے رہنا ضروری ہوگیا ہے
کون جانے کب
فسادوں کے تاجر
زندگی کے ٹھہراؤ سے اُکتا کر
رات کی تاریکی میں
کسی عمارت کی کشادہ پیشانی پر
مندر یا مسجد لکھ کر
ہندی اُردو کے ایسے اخباروں کی
اشاعت بڑھادیں
جن کے پڑھنے والوں کی
تعداد نہ ہونے کے برابر ہے

❀❀❀

جہیز

ایوب سلامت
0922615619

چلو تم کو سناتا ہوں
کہانی میں غریبی کی

جہاں اک باپ روتا ہے،
جہاں ایک ماں بلکتی ہے،
جہاں ایک چاندی بیٹی،
نگاہوں میں کھٹکتی ہے۔
اسی گھر کا یہ قصہ ہے۔۔۔
کہ اک دن کار سے کچھ لوگ
اتر کر گھر میں آتے ہیں،
یہ خوش خبری سناتے ہیں۔
تمہاری چاندی بیٹی!!
ہمیں بے حد پسند آئی،
یہ سن کر باپ کے رخ پر،
مسرت عود کر آئی۔۔۔
بوڑھے ماں باپ کے لب پر،
کھلی مسکان جو دیکھی،
تو وہ مہمان جھٹ بولے!
ابھی ہو جائے منگنی بھی۔۔۔
نہ پوچھا کچھ نہ پرکھا کچھ
فقط اقرار کر بیٹھے
کہ خود اپنی ہی بیٹی پر،
اچانک وار کر بیٹھے۔
ہوا جب رشتہ پکا تو،
وہ اپنے خول سے نکلے،
بتایا پھر جہیز اتنا
کہ بوڑھے کی نگاہوں سے،
دو آنسو خوں کے نکلے،
سمجھ میں آگیا اس کو
یہ انساں نہیں درندے ہیں،
جہیز اوزار ہے ان کا،
اسی پہ جاں چھڑکتے ہیں۔
پھر اس نے بیچ ڈالا سب
جو اس کے پاس تھا اپنا
کھلی آنکھوں سے بیٹی کی،
خوشی کا دیکھ کر سپنا۔
بیاہ کے بعد کے کچھ دن،
بڑے آرام سے گزرے،
پھر اک دن یہ خبر آئی،
کہ ان کی لاڈلی بیٹی،
کچن کی آگ میں جل کے،
خود اپنی جان کھو بیٹھی،
بوڑھے ماں باپ کو پھر بھی،
سمجھ میں آگیا تھا یہ،
کہ ان کی لاڈلی بیٹی،
نہ تن ہاری نہ من ہاری،
جہیز اک مرض ہے ایسا،
جو سب مرضوں پہ ہے بھاری،
اسی کی آگ میں جل کے،
وہ رب کو ہوگئی پیاری۔۔۔۔
چلو تم کو سناتا ہوں
کہانی میں غریبی کی۔۔۔۔۔۔

❀❀❀

"منظرِ گجرات اب تک ہے نظر میں دوستو! ❀❀ کیسے کہہ دوں کہ مرا ہندوستاں آزاد ہے۔"
ادھو مہاجن بسمل 09579449635 (مجموعہ "حرفِ غزل" صفحہ 69)

افسانچہ

گاؤں بدر

م۔ناگ

09221747124

سمرو کی لڑکی جوان تو تھی،خوبصورت بھی تھی۔اُسے گاؤں کے چودھری کا لڑکا بھگا لے گیا۔سمرو نے پنچایت بُلائی۔اُسے یقین تھا کہ پنچوں میں پرمیشور واس کرتے ہیں۔اس لئے اُسے انصاف ملے گا۔پنچایت نے سمرو کی بات کو بڑے دھیان سے سُنا،چودھری اور اُس کے خاندان والوں کی بات بھی سُنی۔کچھ گواہوں کے بیان بھی لئے،فیصلہ سُنایا کہ سمرو کی لڑکی ہی بدچلن تھی۔وہ بھگائی نہیں گئی بلکہ وہ خود چودھری کے لڑکے کو بھگا لے گئی ہے۔اس لئے سمرو اور اس کے خاندان والوں کو گاؤں بدر کر دیا گیا۔کچھ ہی دنوں کے بعد ہریجنوں کے ایک لڑکے کے ساتھ اسی چودھری کی دوسری لڑکی بھاگ گئی۔اس بار چودھری نے پنچایت بُلائی۔پنچایت نے چودھری اور ہریجن خاندان کی بات بڑے دھیان سے سُنی۔گواہوں کے بیان بھی لیے۔آخر میں پنچایت نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔لوگوں نے جے جے کار کی۔فیصلہ تھا کہ ہریجن لڑکے نے چودھری کی بھولی بھالی لڑکی کا اغوا کیا ہے اس لئے پنچایت اس ہریجن خاندان کو سزا کے طور پر گاؤں بدر کرتی ہے۔

❁❁❁

افسانچہ

کشکول

راجہ یوسف کشمیر

09419734234

رات کی تاریکی کا سینہ چیرتے ہوئے سورج نے کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔۔۔سڑکوں پر لوگوں کی بھیڑ یاس کی نشانی کی طرح پھیلنے لگی اور بازار معمول کی رنگینیوں میں ڈوب گیا۔۔۔

سڑک کے ایک کنارے پر بیٹھی شکورن کمزور آواز میں لوگوں کو اپنی جانب راغب کرنے میں لگی تھی،ساتھ ہی ایک ہاتھ سے اپنے دو سالہ بچے کو تھپکی بھی دے رہی تھی۔۔۔لوگوں کی نظریں جب اس کے لاغر اور زرد چہرے والے بچے پر پڑتی تھیں تو ان کے ہاتھ مشینی انداز میں جیبوں کو ٹٹولنے لگتے تھے،اور پل بھر میں شکورن سکوں سے بھرا کشکول لے کر اپنی جھونپڑی میں چلی جاتی تھی۔۔۔۔۔

سڑک کی دوسری جانب بیٹھی حمیدن یہ تماشہ دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی۔۔۔ دن بھر لوگوں کے سامنے گڑگڑانے کے باوجود اُسے بھوکے پیٹ جو سونا پڑتا تھا۔۔۔

ایک دن ایسا ہوا کہ صبح سویرے میونسپلٹی والے کوڑے کرکٹ کے ساتھ لاوارث شکورن کی لاش بھی لے گئے۔۔۔اور اس کا دو سالہ بچہ ۔۔۔،اُسے حمیدن اپنے بچے کی طرح سینے سے چمٹائے بیٹھی تھی اور جگمگاتے سکے اس کی برسوں کی پیاسی جھولی کو سیراب کرتے جا رہے تھے۔۔ لیکن شکورن کی موت کا سبب بننے کے باعث اُبھرا ندامت کا جذبہ اس کی ساری خوشیوں کو جیسے گہن لگا رہا تھا۔

❁❁❁

غزل

مصداق اعظمی

09793098128

جس طرح سُنتے ہیں مشتاق ہوئے جاتے ہیں
زہر کے عیب بھی تریاق ہوئے جاتے ہیں

دوسرے درجے کے لوگوں سے تعلق رکھ کے
آئے دن آپ بداخلاق ہوئے جاتے ہیں

ہم بھی کچھ بند کتابوں کی طرح ہیں لیکن
آپ کے سامنے اوراق ہوئے جاتے ہیں

شعر کہنے کا ہنر چھین لے یارب ہم سے
ہم اسی جُرم میں بس عاق ہوئے جاتے ہیں

درد کی شمع میرے دل میں فقط جلنے سے
یاد ماضی کے سیہ طاق ہوئے جاتے ہیں

یہ خبر قافلے والوں کو سُنا دی جائے
رہنما اِن دنوں قذاق ہوئے جاتے ہیں

میرے سورج کو چھپانے کے لئے روزانہ
وہ میرے واسطے آفاق ہوئے جاتے ہیں

آپ تو آپ ہیں قطرہ ہوں یا دریا صاحب
آپ کیوں حضرتِ مصداق ہوئے جاتے ہیں

❁❁❁

"جھارکھنڈ میں پرکاش فکری،سید احمد شمیم،وہاب دانش اور اسلم بدر کے ساتھ اگر صدیق مجیبی کا نام نہ لیا جائے تو بددیانتی ہوگی۔ان کے اشعار پڑھتے ہی قاری کے حافظے کا حصہ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔" وقار قادری 09204724931 (سخنوران جھارکھنڈ (حصہ اوّل) صفحہ 264)

غزل

ممتاز نازاں
09867641102

کھل رہی ہیں کہکشاں کی خوبیاں
منجمد ہیں عقل کی باریکیاں

آگ کی لپٹیں ،دھواں،چنگاریاں
اور ہوا دیتی ہوئی کچھ آندھیاں

درد، ماتم، اشک، غصہ، تلخیاں
راکھ ،اُجڑے گھر ،سُلگتی سِسکیاں

کوئی بھی اپنا نہیں ہے دُور تک
ہر طرف کچھ اجنبی پر چھائیاں

کس طرح لاؤں حصارِ لفظ میں
فکر کی یہ بیکراں گہرائیاں

میں کروں جب بھی سفر کا حوصلہ
روک لیں راہیں شکستہ پائیاں

مستقل فتنہ گری تہذیب کی
آدمی کی پے بہ پے آزادیاں

ریزہ ریزہ ہو کے بکھرا ہے وجود
چُبھ رہی ہیں پاؤں میں یہ کرچیاں

کیا دیا ممتازؔ حسرت نے ہمیں
اُلجھنیں ، دُشواریاں ، ناکامیاں

❀❀❀

غزل

رانا احمد شہید
شعبہ انگریزی،حافظ حیات کیمپس
گجرات یونیورسٹی، گجرات، (پاکستان)

پر کاٹ کر میرے مجھے آزاد کر گیا
کیسا ستم یہ مجھ پر وہ صیاد کر گیا

ہے آفتاب میں وہ تباہی کہ الامان
نکلا تو خواب سارے ہی برباد کر گیا

اس وقت میں ہے خوبیِ تلخیص بے پناہ
صدیوں کی داستان کو جو روداد کر گیا

ممنون ہوں میں غم کا اسی واسطے کہ یہ
نازک سے میرے جسم کو فولاد کر گیا

کیا دُشمنی تھی اس کو سکون و قرار سے
وہ کون تھا جو عشق کو ایجاد کر گیا

❀❀❀

غزل

قسیم اخترؔ
09470120116

آنکھوں میں سمندر کو چھپا کیوں نہیں لیتے
ہونٹوں پہ تبسم کو سجا کیوں نہیں لیتے

ٹکرا کے در و بام سے ہو جائے نہ زخمی
تم اپنی صداؤں کو بلا کیوں نہیں لیتے

بیٹھا ہے بہت دیر سے وہ تیری گلی میں
پتھر کوئی ہاتھوں میں اُٹھا کیوں نہیں لیتے

آ جائے کہیں اور جگر برق کی زد میں
رخسار پہ زلفوں کو گرا کیوں نہیں لیتے

قرآن کا پاکیزہ ورق دل ہے ہمارا
اس دل کو کلیجے سے لگا کیوں نہیں لیتے

تہذیب کا گرتا ہوا مینار ہوں اخترؔ
گرنے سے جہاں مجھ کو بچا کیوں نہیں لیتے

❀❀❀

"میری بربادی میں تھا ہاتھ کوئی پوشیدہ ❀❀ اُس نے جب ہاتھ ملایا تو مجھے یاد آیا"

حیرت فرخ آبادی 09431917878 (مجموعہ کلام "حسنِ التماس" صفحہ 41)

خراجِ عقیدت

مقبول عوامی لیڈر، ایک طویل عرصے تک سرپنچ کے عہدے پر فائز، معروف گورنمنٹ پلیڈر، غریبوں کے مسیحا، صوبہ جھارکھنڈ میں اردو زبان کے فروغ کے لئے دِل وجان سے کوشاں،

جناب انوارالحق ایڈوکیٹ (مرحوم)

کی یاد میں میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ایم۔اے۔حق نے یہ کتابی سلسلہ ''عالمی انوارِ تخلیق'' کا اجراء کر کے اُنہیں صحیح معنوں میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

میری دعاء ہے کہ اردو ادب کا یہ نوزائیدہ پودا خوب پھلے پھولے۔ آمین

محمد انصار الحق

09304907284

Md Ansarul Haque

Rtd Mechanical Engineer

Haque Manzil

Moh:. Dudhani,

Po,Ps,& Dist Dumka

مبارک ہو دوست

جھارکھنڈ کونسل آف لیگل رائٹس کے چیئر مین کی حیثیت سے پورے جھارکھنڈ صوبے میں عوام کو اُن کے حقوق سے واقف کرانے واُن کی حصولیابی میں آنے والی دُشواریوں کو دور کرنے میں مصروف ، جھارکھنڈ سرکار میں ڈسٹرکٹ کنزیومر فورم کے ممبر کا ایک ذمّہ دار عہدہ سنبھالتے ہوئے، ہیومن رائٹس میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ لینے کی وجہ کر Human Rights Activist کا رول ادا کرنے میں دلچسپی لینے والے، اور افسانچوں کی دُنیا میں لگاتار اپنی معیاری تخلیقات سے قارئین کو چونکانے والے ڈاکٹر ایم۔اے۔حق کی ہمّت کی میں داد دیتا ہوں کہ اُنہوں نے اپنی بے پناہ مشغولیت کے باوجود عالمی سطح پر اتنا شاندار رسالہ ''عالمی انوارِ تخلیق'' جھارکھنڈ جیسے صوبے سے نکالنے کی جسارت کی ہے۔

مطیع الزماں

08084620466

Apna Telicom Centre Ara More,
Dhanbad

''چاروں طرف گہری تاریکی کے درمیان آندھی طوفان سے بچا کر، اگر مٹی کا چراغ جلائے چپ چاپ بیٹھی رہ سکوں تو وہی میری کامیابی ہے۔ میں وہی روشنی بن کر تمہارے پاس رہوں گی'' مصنف ڈاکٹر مسعود جامی 09504969822 (میرے دیش کی مٹی (ناول) صفحہ 245)

"وہ بھلا منزلِ مقصود پہ کیا پہنچے گا ❖ وہ مسافر جو ہر اک راہ پہ چل پڑتا ہے۔"

زم زم رام نگری 09450670548 (سہ ماہی "بزمِ سعید" بنارس جنوری تا مارچ 2014)

قلمکار حضرات سے التماس

(۱) صرف اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات ہی ہمیں ارسال کریں۔نیٹ رسائل پر بھی شائع ہونے کی صورت میں اُسے مطبوعہ سمجھا جائے گا۔ادارہ اسے شائع کرنے سے قاصر ہے۔

(۲) ''عالمی انوارِ تخلیق'' میں بھیجنے کے بعد اگر آپ کی کوئی تصنیف کسی دوسرے رسالے میں شائع ہو جاتی ہے تو برائے مہربانی اس کی اطلاع ادارے کو دے کر اپنی ادبی دیانت داری کا ثبوت پیش کریں۔

(۳) اگر ممکن ہو سکے تو تخلیقات ای میل سے بھیجیں۔ای میل سے بھیجنے پر اس کی اطلاع ہمیں بذریعہ فون ضرور دیں۔

(۴) ان پیج میں بھیجنے پر ہم آپ کو دل سے دعائیں دیں گے۔

(۵) ڈاک سے بھیجنے کی صورت میں خوشخط یا ٹائپ شدہ ہو تو بہتر ہے۔یہاں ڈاک کا ناقص انتظام ہے۔رجسٹرڈ ڈاک سے ارسال نہیں کرنے پر آپ کی تخلیقات کے ملنے کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔

(۶) اپنی تخلیق کی ایک کاپی ضرور اپنے پاس محفوظ رکھ لیں۔اس کی اشاعت نہیں کرنے کی صورت میں واپس بھیجنا ممکن نہیں ہے۔

ادارہ..........................

''اگر آپ اجازت دیں تو میں صرف ایک دن کے لئے یہ منی اسکرٹ پہن کر صبح سے شام تک مجسمے کی جگہ کھڑی رہوں۔''

شمس الہدیٰ انصاری (مالیگ) 09431172728 افسانہ ''منی اسکرٹ'' (ماہنامہ ''زبان و ادب'' پٹنہ، جنوری 2014)



سراپا اُردو ڈاکٹر ایم۔اے۔حق

کی حوصلہ افزائی نہ کرنا ادبی بددیانتی ہوگی

''عالمی انوارِ تخلیق'' کا اجراء

اُن کا ایک نہایت ہی قابلِ فخر کارنامہ ہے

میں اس کے لئے اُنھیں تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں

عرفان عزیز

(ریٹائرڈ) ایڈیشنل رجسٹرار کوآپریٹو سوسائیٹیز

جھارکھنڈ سرکار

ایجوکیشن ڈائریکٹر جھارکھنڈ کونسل آف لیگل رائٹس، رانچی

موبائل۔09431283069

خوشخبری **خوشخبری**

بک اسٹال مالکان کیلئے
شرائطِ ایجینسی

(۱) کمیشن ۴۰ فی صد دیا جائے گا

(۲) کم از کم تعداد میں کاپیاں منگوانے کی کوئی قید نہیں

(۳) غیر فروخت شدہ کاپیاں واپس لے لی جائیں گیں۔

(۴) ۵۰ یا اُس سے زائد کاپیاں بیچنے پر کمیشن ۵۰ فی صد دیا جائے گا۔

(۵) ۱۰۰ یا اس سے زائد کاپیاں بیچنے والوں کی رنگین تصویر مع
☆ شخصی کوائف اگلے شمارے میں شائع کی جائے گی۔

مدیر اعلیٰ

''میں ہوں تمہاری عاشق مجھ کو ہے تم سے اُلفت ❀ بے اختیار تم کو جو چاہے نام دے دو''
شبنم اُلفت 08286918080 (خاتون مشرق مئی 2014)

اردو زبان

اردو زبان کی خوبصورتی کا راز اس کی اسکرپٹ، تلفظ اور ادب میں پنہاں ہے۔

ٹھیک اُسی طرح سو سال سے بھی زیادہ پُرانے ہمراز ہیں ہم خوبصورتی میں چار چاند لگانے والی خواتین کے۔

ہر سال کی طرح اس سال بھی عید الفطر کے موقع پر نئے ڈیزائنوں کے آئٹم آپ کا استقبال کریں گے۔

New M.S.Gauhar Ali

All Types Of Imitations,Jewelry,

Fancy Rubber Bindi,

Back clips, Bangles &

Cosmetics Items

(AND MANY MORE)

Opp Bank of Baroda,

Main Road ,Ranchi

Proprietor:- Md.Sajid(9334710545)



Dr. N.K. Prasad

M.B.B.S. (Pat) MD. (Pat) F.I.C.P. (India)

اردو کی حفاظت

اردو ہندوستان کی آبرو ہے۔

آیئے ہم سب مل کر اس کی حفاظت کریں۔

اس کی حفاظت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس زبان میں رانچی سے شائع ہونے والے انٹرنیشنل رسالے "عالمی انوار تخلیق" کو پروان چڑھا کر اپنے شہر، صوبہ اور ملک کا نام روشن کریں۔

ڈاکٹر این کے پرساد

"پروفیسر غازی علم الدین نے اپنی کتاب 'لسانی مطالعے' میں لسانی تحقیق کے نئے زاویے کے تناظر میں جہاں الفاظ کی نیرنگی اور بوقلمونی کا ذکر کیا ہے وہاں اس امر پر بھی توجہ دی ہے کہ ہر لفظ تحقیق کا متقاضی ہے۔" پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

مضمون 'پروفیسر غازی علم الدین کی کتاب "لسانی مطالعے"' (سہ ماہی "اصنام شکن" اپریل تا جون 2014)

"اسے اپنی ماں کو دیکھ کر اونچی عمارتوں پر لگی برقی موصل کی وہ فولادی چھڑی یاد آجاتی تھی جو کڑکتی بجلیوں کا سارا زور اپنے اندر جذب کر کے عمارت کو تباہ ہونے سے محفوظ رکھتی ہے۔" سلام بن رزاق 09967330204 "زندگی افسانہ نہیں" (ماہنامہ "بیباک" مالیگاؤں، جنوری 2014)

کشمکش

ایم۔آئی۔حق
09572453329

ادھ کھلی سوتی ہوئی
وہ پرکشش آنکھیں
کہتی ہے مجھ سے
آمیرے پہلو میں
اب بھی وقت ہے
سوچتا ہوں کہ میں
جاؤں نہ جاؤں
خوف مجھ پہ ہے طاری
دل اُداس ہے اور بھاری
نہیں۔۔نہیں۔۔۔نہیں
کبیرہ ہے یہ گناہ
لیکن۔۔۔
کشش ہے بے پناہ
نفس وجود سے مرے چمٹی
بالآخر مری بانہوں میں وہ کھنچی
اور سماتا چلا گیا میں
اُس خوش نُما دلدل میں
لیکن۔۔۔
درحقیقت بدنما جنگل میں

❁❁❁

آہ! صدیق مجیبی



(1931-6th March 2014)

اپنا سرکاٹ کے نیزے پہ اُٹھائے رکھا
صرف یہ ضد ہے کہ مرا سر ہے تو اُونچا ہوگا

برصغیر کے منفرد لب و لہجے والے واحد شاعر ڈاکٹر صدیق مجیبی آج ہمارے بیچ نہیں ہیں۔ "عالمی انوار تخلیق" کے اجراء کے موقع پر اُن کی غیر موجودگی کا ہمیں شدت سے احساس اس لئے بھی ہو رہا ہے کہ یہاں کی ہر چھوٹی بڑی محفل میں اُن کی موجودگی لازمی تھی۔

ڈاکٹر ایم۔اے۔حق

❁❁❁

جھٹکے کا گوشت

ذاکر فیضی
08750469113

ہوٹل کے کمرے میں صاحب نے کھانے کا آرڈر دیتے ہوئے ویٹر کو تاکید کی "اور ہاں! دیکھو میٹ حلال کا ہونا چاہیے۔ میں جھٹکے کا گوشت نہیں کھاتا۔"

"جی بالکل سر! ہمارے یہاں ذبح کیا ہوا گوشت ہی ملتا ہے۔"

لڑکا آرڈر لے کر جانے لگا تو صاحب نے پھر آواز دی "ارے سنو! ہاں یہ بتاؤ" صاحب نے جھجکتے ہوئے اپنی ناک پر اُنگلی رکھتے ہوئے پوچھا، "یہاں یہ گوشت بھی ملتا ہے۔۔۔میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا۔۔۔۔ہاں وہی۔۔۔گرم گوشت۔"

"کیوں نہیں سر! بالکل ملتا ہے۔"

"تو ڈنر کے بعد اُس کا بھی انتظام کردو"

"ٹھیک ہے سر!" لڑکے نے کہا۔ پھر وہ جاتے جاتے رُکا اور پیچھے مڑکر مُسکرا کر پوچھا "سر یہ گوشت حلال کا ہو یا۔۔۔۔

❁❁❁

"ایک ادیب اور ناول نگار کی سطح پر حسین الحق سماجی حقیقت نگاری کو ماحتیں بنا کر زندگی کے ایسے منظر بن جاتے ہیں کہ ان کی رواں رواں نثر کو پڑھتے ہوئے قاری ششدر رہ جاتا ہے" مشرف عالم ذوقی 09310532452 مضمون "اردو ناول کی گم ہوتی ہوئی دنیا" (سہ ماہی "ابجد" ارریہ جولائی تا دسمبر 2013)

غزل

ساحر داؤدنگری
09868706845

سفر سراب کا شاید مرا مقدر ہے
یہ دشت کیا ہے مری پیاس کا سمندر ہے

یہ بات اور بہت پُر سکوں ہوں باہر سے
غضب کا شور مگر میرے دل کے اندر ہے

ذرا سی دیر میں سارے شجر برہنہ ہوئے
ہوا کے ہاتھ میں آخر یہ کیسا خنجر ہے۔

مری غزل مرے اظہار میں سماتا نہیں
وہ کوئی اور نہیں آپ ہی کا پیکر ہے

میں اور نذر کروں کیا مری انا تجھ کو
رکھا ہوا مرے شانوں پہ اک یہی سر ہے۔

❀❀❀

ایک اہم اطلاع

"معاونینِ عالمی انوارِ تخلیق" کی مقبولیت بامِ عروج پر ہے۔ اگر آپ اس اسکیم میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو مدیرِ اعلیٰ سے رابطہ قائم کریں۔ ادارہ

"معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس کی پیشانی پر پسینے کی بے شمار بوندیں پھوٹ پڑیں اور چہرے پہ خوف دبے چینی کی لہر دوڑ گئی"
شیخ بشیر احمد 09858989900 افسانہ "بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے" (ماہنامہ "انشاء" کولکاتا مئی جون 2014)

افسانچہ

لوہے کا فرق

نسیم محمد جان

"دلّو میاں"

"جی میم صاحبہ"

"آپ ہمیشہ اس بڑی والی چھری کے ساتھ سوتیلے پن کا سلوک کرتے ہیں۔"

"کیا ہوا ہے۔ دونوں کو چمکا دیا ہے۔"

"مگر بڑی والی ہمیشہ جلد کند ہو جاتی ہے، اس کی چمک جلد ہی ماند پڑ جاتی ہے۔"

"اس کو تو بہت دیر تک رگڑتا ہوں"

"پھر ایسا کیوں ہوتا ہے چھوٹی والی تیز رہتی ہے اور بڑی والی بے کار ہو جاتی ہے۔"

"میم صاحبہ! لوہے لوہے کا فرق ہے۔"

❁❁❁

غزل

شاذیہ نورین

سکوت جب بھی کبھی محو گفتگو ہو گا
تو شور دل کی خموشی کا چار سو ہوگا

یہ کون ہے جو مقابل کھڑا ہوا ہے میرے
اس آئینے میں مَیں نہیں تو تُو ہوگا

پیام ترکِ تعلق مجھے نہیں تسلیم
یہ فیصلہ بھی اگر ہوگا رو برُو ہوگا

نہیں بچا ہے پسِ چشم اب تو ایک بھی اشک
کبھی جو آنکھ سے ٹپکا بھی تو لہو ہوگا

رہی نہ سانس، کھلی رہ گئیں آنکھیں
کہیں گمان میں ہنگام جستجو ہوگا

❁❁❁

''عالمی انوار تخلیق'' کی اشاعت پر

ہماری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیں

(۱) ایم۔آئی حق ایڈوکیٹ (۲) محمد انصار الحق ریٹائرڈ میکینکل انجینئر (۳) احسان الحق میکینکل فٹر (۴) محمد نسیم الحق ایڈوکیٹ
(۵) محمد شمیم الحق پارا ٹیچر (۶) محمد اکرام الحق پارا ٹیچر (۷) محمد انعام الحق ڈی۔ٹی۔او آفس

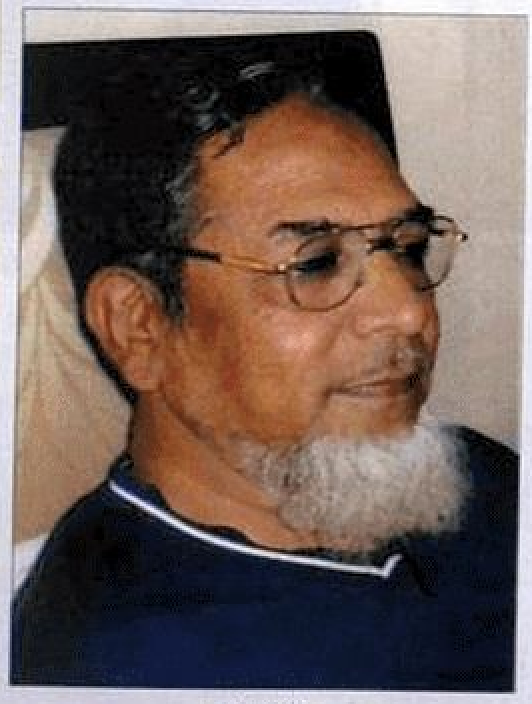
سبھی حق فیملی حق منزل، دودھانی، دُمکا (سنتھال پرگنہ)

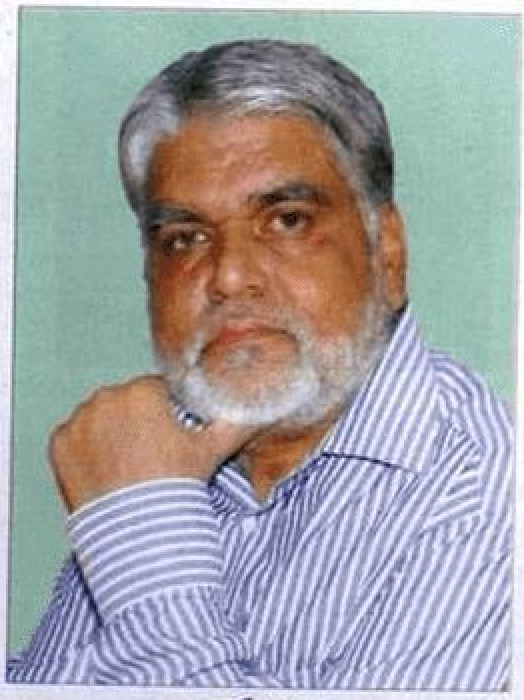
ادارتی بورڈ عالمی انوارِ تخلیق

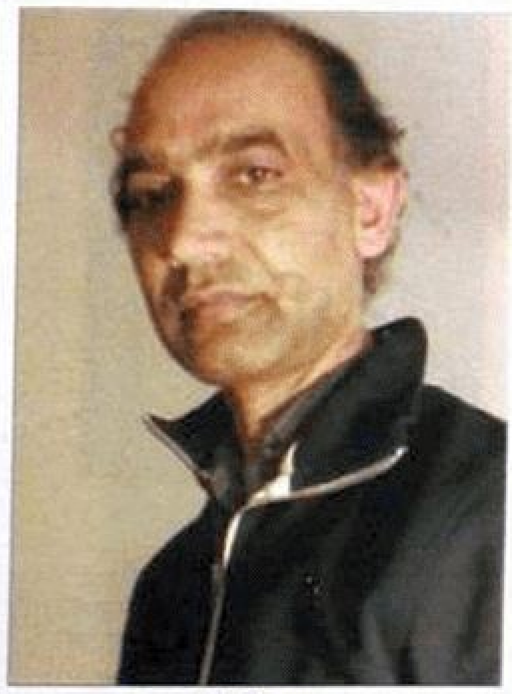












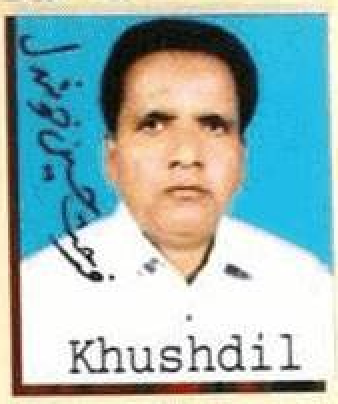
معاونین عالمی انوارِ تخلیق



ممتاز عزیز نازاں (شاعرہ)
169/173,Nishanpada Road Mumbai-400009
09867641102./08756816181
mumtazaziznaza@gmail.com
Patna 800007



ایم۔ آئی۔ حق (ادب نواز)
Senior Advocate
Abdur Razzaque Colony
Nr Masjid,Alamganj Patna800007
09572453329:nasirdost@rediffmail.com



فرحت حسین خوشدل (شاعر/ناقد)
Dept. Of Urdu, +2 Zila School,
Hazaribagh. 825301- 09798562194
khushdilhzb@gmail.com



نور شاہ (افسانہ نگار)
14-LAL DED COLONY GOURIPORA
LINK ROAD RAWALPORA SRINAGAR
190005. KASHMIR-09906771363



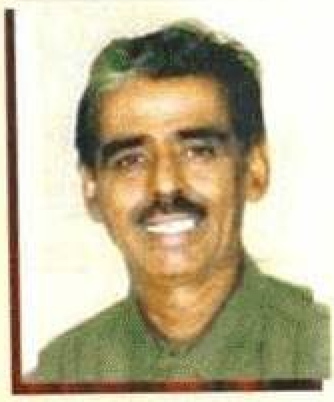
رحیم رضا (افسانہ/افسانچہ نگار)
2587 Raza Manzil
Khirnipura At&Post Yawal 425301
Dist. Jalgaon(M.S)
09890007154:raheemraza963@gmail.com



کامران غنی صبا (صحافی)
Bureau Chief,Urdu Net Japan
c/o Hakeem Alimuddin Balkhi
Main Road ,Alamganj800007
P.O.Gulzarbagh,Patna
09835450662:kamran2ghani@gmail.com



آسنگنی مشتاق رفیقی (شاعر)
Asangani Mushtaq Ahmed
Darul Ashfaq,No 9/258,
2nd Street,Basheerabad Vaniyambadi 635751
09894604606: asanganimushtaq@gmail.com



سجاد بخاری (شاعر)
8/2 Sundram lane, Parsawakam,
chinnai-600007, 09884371483
Bukhari.sajjadas@gmail.com



زرینہ خان (شاعرہ)
Ashiana Building
c/o Late Abdul Qadeer Khan
Opp; Hotel Bombay Palace
Diamond Road,Civil Line
Ram pur. (U.P)09897305937



سراج فاروقی (افسانہ/افسانچہ نگار)
703-Wadghar
Nr College Thata,Panvel,410206
Dist.Raigarh(Maharashtra)
08108894969:sirajf69@gmail.com



نثار احمد (ادب نواز)
Director Reliabe Construction Co.
303 A Dharti Complex, A Building,
Evershine enclave Rd. Nr. Umro Hospital
Meera Rd,East Thane 401107
09323279063:rccnesar@gmail.com



راجہ یوسف (افسانہ/افسانچہ نگار)
Anchidora,Anant Nag,192101
Kashmir(J.K) 09419734234:
rajayousuf@gmail.com



محمد اسرارالحق (ادب نواز)
Labour Enforcement Officer
c/o Late Fazle Haque
Indian Medical Hall
Teen Pahar, Dist;-Sahibganj
(Jharkhand) 09798672650



محمد شکیل انصاری (شاعر)
11/I,P.K.Das Lane
P.O:-RishraDist:- Hoogly712248(W.B)
08276803961
aim_compc@yahoo.com



ایوب سلامت (شاعر)
Warispura,J.N.Rd
Near Bhondu Chakki
KampteeDist Nagpur441001(M.S)
09226156199:ayyubsalamat@gmail.com



فوزیہ رحمان (عرشی) (ادب نواز)
Proprietor,F.S.Marraige Consultancy
Rahmat Colony, Doranda,Ranchi834002
08409224941
foziasubhan@gmail.com

کاویری ریسٹورینٹ پکوانوں کی شان ہے
جس طرح سب زبانوں میں اردو زبان ہے

عالمی انوارِ تخلیق کی اشاعت صوبہ جھارکھنڈ کے لئے باعثِ فخر ہے



KAVERI RESTAURANT

9-11 GEL CHURCH SHOPPING COMPLEX

Mahatma Gandhi Marg(Main Road)Ranchi 834001 Jharkhand
Landline:- +91-651-2330330/2330300
Handphone:- +91-9431307777 Facisimile:- +91-651-2330017
Email:- kunwarbh@gmail.com
Website:www.thekaveri.com